عہدِ نبویؐ میں نظامِ مالیہ و تقویم

خطبات بہاولپور، خطبہ نمبر۱۱

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

عہدِ نبویؐ میں نظامِ مالیہ و تقویم

خطباتِ بہاولپور۔ خطبہ نمبر: ۱۱

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

www.facebook.com/Dr.Muhammad.Hamidullah

www.facebook.com/payamequran

www.drmhamidullah.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیرِ نظر مضمون "عہدِ نبویؐ میں نظامِ مالیہ و تقویم" دراصل اس سلسلے کا گیارہواں لیکچر ہے جو ۱۹۸۰ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مرحوم) نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں مسلسل بارہ روز متعدد اسلامی موضوعات پر دیے تھے جو خطباتِ بہاولپور کے نام سے شائع ہوں چکے ہیں۔

فہرست

کچھ مصنف کے بارے میں

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب 1908ء کو علوم اسلامیہ کے گہوارے حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ نے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے، ایل ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے لیے یورپ پہنچے۔ بون یونیورسٹی (جرمنی) سے اسلام کے بین الاقوامی قانون پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی فل کی ڈگری حاصل کی اور سوربون یونیورسٹی (پیرس) سے عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف لیٹرز کی سند پائی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ عرصے تک جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پروفیسر رہے۔ یورپ جانے کے بعد جرمنی اور فرانس کی یونیورسٹیوں میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ فرانس کے نیشنل سنٹر آف سائنٹفک ریسرچ سے تقریباً بیس سال تک وابستہ رہے۔ علاوہ ازیں یورپ اور ایشیا کی کئی یونیورسٹیوں میں آپ کے توسیعی خطبات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

ڈاکٹر صاحب السنہ شرقیہ اردو فارسی عربی اور ترکی کے علاوہ انگریزی فرانسیسی جرمن اطالوی وغیرہ زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ چنانچہ مختلف اقوام و ادیان کے تاریخی اور تقابلی مطالعے کی بدولت آپ کے مقالات اور تصانیف کا علمی و تحقیقی مرتبہ نہایت بلند ہے۔ فرانسیسی زبان میں آپ کے ترجمہ قرآن مجید اور اسی زبان میں دو جلدوں پر مشتمل سیرت پاک کو قبول عام حاصل ہوا۔ عالمی شہرت یافتہ کتاب Muhammad Rasul Allah کے مصنف ہیں۔ اس کے علاوہ

The Battlefields of Prophet Muhammad

The Muslim Conduct Stare

The First Written Constitution

الوثائق السیاسیہ العھد النبوی والخلافۃ الراشدہ

خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علاوہ ازیں علم حدیث کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا اہم ترین کارنامہ "صحیفہ ہمام بن منبہ" کی تحقیق و اشاعت ہے۔ یہ قدیم ترین مجموعہ احادیث ہے جو عہدِ صحابہ میں مرتب ہوا تھا۔ آپ نے اس نادر و نایاب ذخیرہ حدیث کا ایک مخطوطہ برلن میں دریافت کیا اور اسے جدید اسلوب تدوین کے مطابق مرتب کر کے شائع کرایا۔ خدمت قرآن کے سلسلے میں آپ نے پچپن برس قبل تراجم قرآن حکیم کی ببلیو گرافی "القرآن فی کل لسان" مرتب کی جس میں دنیا بھر کی ایک سو بیں زبانوں میں قرآن کے تراجم کا تذکرہ اور بطور نمونہ سورہ فاتحہ کے تراجم درج ہیں۔

تو یہ ہے اس شخص کا مختصر تعارف جس نے مغرب کی نئ نسل کو اسلام سے قریب تر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جو تقریباً نصف صدی سے زائد علم کے موتی لٹاتا رہا، جو زندگی کی آخری سانس تک فاطمہ کے بابا کے عشق میں سلگتا رہا۔۔۔ جلتا رہا۔۔۔ جلاتا رہا

خدا اس پر رحمتیں نچھاور کرے۔

محترم صدر! محترم ڈین! محترم مہمانانِ گرامی!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

الحمدللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وآلہ واصحابہ اجمعین!

آج کا موضوع مالیات سے متعلق ہے۔ یہ اس بناء پر ایک اہم موضوع ہے کہ قرآن مجید میں مال کو انسانیت کی بقاء اور انسانیت کے قیام کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔"أَمْوَٰلَكُمُ ٱلَّتِى جَعَلَ ٱللَّهُ لَكُمْ قِيَـٰمًا" (۴:۵) اس لحاظ سے قرآن میں ہی اس چیز کا اب سے چودہ سو سال پہلے ذکر آچکا ہے کہ مال کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر زمانہ حال میں لوگوں کو یہ کہا جاتا ہے کہ مال کی بڑی اہمیت ہے اور دین اس سے غفلت برتتا ہے۔ لہذا کمیونسٹ بننا چاہئیے تو میں کہوں گا کہ اب سے چودہ سو سال پہلے مسلمانوں کو ان کے دین نے یہ بتادیا تھا کہ زندگی ایک دن بھی مال کے بغیر نہیں گزر سکتی۔ البتہ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ پرانے ادیان کی پالیسی اور اسلام کی پالیسی میں کیا فرق پایا جاتا ہے تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ آیا اسلامی احکام بہتر ہیں یا نہیں، اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی چیز کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا اور وہ ایک طرح سے معذرت ہوگی۔ اسلامی مالیات پر ہمارے فقہانے نہایت قدیم زمانے سے ہی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً امام ابو یوسف کی کتاب "الخراج" یحییٰ ابن آدم القریشی کی کتاب "الخراج" ابوعبید قاسم بن سلام کی کتاب "الاموال" اور اسی طرح کی اور کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ کئی ایک چھپ بھی چکی ہیں۔ میں ان ساری کتابوں کے مؤلفوں کا پورا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے عرض کروں گا کہ ان میں ایک کوتاہی نظر آتی ہے، وہ یہ کہ انہوں نے تاریخی نقطہ نظر کو ملحوظ نہیں رکھا۔ یعنی یہ کبھی نہیں بتایا کہ عہدِ نبویؐ میں مالیات کے متعلق ابتدائی صورت یا ہجرت سے پہلے مکہ میں کیا صورت تھی، مدینہ آنے کے بعد ابتداء کیا تھی، رفتہ رفتہ کیا تبدیلی ہوئی اور بالآخر اس نے کیا صورت اختیار کی؟ ان باتوں کا وہ کہیں بھی ذکر نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہمارے دلوں میں خلش

رہ جاتی ہے۔ مثلاً ہمارے مؤرخ اور فقہاء بھی کہتے ہیں کہ زکوٰۃ ۹ ہجری میں فرض ہوئی "آمنا و صدقنا" لیکن آپ قرآن مجید کی مکی سورتوں میں بھی لفظ زکوٰۃ کا استعمال پاتے ہیں تو مسئلہ الجھ جاتا ہے۔ میں اسی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کروں گا کہ عہدِ نبویؐ میں مالیہ کا کس طرح آغاز ہوا۔ باقی تفصیلات پر ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اگر یہ سب تفصیلات بیان کرنا چاہوں تو کئی ہفتے درکار ہوں گے۔

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے عرض کیا کہ زکوٰۃ کا ذکر ہم کو مکی سورتوں میں بھی ملتا ہے۔ قبل اسلام کے قدیم مذہبی صحیفوں میں بھی ذکر موجود ہے۔ قرآن میں ابتداء زکوٰۃ کے بارے میں صرف اشارے ملتے ہیں مثلاً ایک آیت ہے: " وَءَاتُواْ حَقَّهُۥ يَوْمَ حَصَادِهِۦ ۖ وَلَا تُسْرِفُوٓاْ ۚ إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ ٱلْمُسْرِفِينَ " (۱۴۱:۶) (جب تم زراعت کی فصل کاٹ لو تو اللہ کا حق اس میں سے ادا کرو)۔ یہاں "اللہ کا حق" سے مراد زکوٰۃ ہی ہے۔ اسی طرح اور بھی آیتیں ہمیں ملتی ہیں جن میں صرف ایک لفظ "زکوٰۃ" نہیں بلکہ کئی اور لفظ بھی اس کے مترادف کے طور پر قرآن میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک معروف ترین لفظ "صدقات" ہے۔ " إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَٱلْمَسَٰكِينِ--- " (۶۰:۹) یہاں صدقہ و خیرات دینا بالکل مراد نہیں بلکہ زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ اسی طرح: " خُذْ مِنْ أَمْوَٰلِهِمْ صَدَقَةً " (۱۰۳:۹) یہاں بھی "صدقہ" کا لفظ گویا زکوٰۃ کے ہم معنی ہے۔ اسی طرح لفظ "انفاق" نیز لفظ "نصیب" بھی ہمیں اسی معنی میں کئی جگہ ملتا ہے۔ غرض یہ کہ مکی دور میں اور مدنی دور میں کبھی ایک لفظ استعمال ہوتا ہے کبھی دوسرا، اور اس کو سمجھے بغیر ہمیں دشواریاں پیش آ سکتی ہیں۔ دوسری چیز جو اتنی ہی اہم ہے وہ یہ ہے کہ اگر مکہ ہی میں زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی، جس معنی میں ہم فرض سمجھتے ہیں، تو اس کا ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یعنی مکہ میں رسول اکرم ﷺ کی طرف سے اس کی وصولی اور خرچ کا انتظام کیا گیا ہو یا اس کی مقدار معین ہو، اس کی میعاد مقرر ہو، اس کا کوئی پتا نہیں چلتا۔ ان حالات میں مجبوراً اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے (اور یہ میری ذاتی رائے ہوگی، آپ پابند نہیں کہ اسے قبول بھی کریں) کہ زکوٰۃ کی ابتداء اور اس کا آغاز اخلاقی اور رضاکارانہ اساس پر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ اپنی تجارت، زراعت اور دیگر کمائیوں سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرو، اور کوئی تعجب نہیں کہ وقتاً فوقتاً مسلمان خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مال پیش کرتے ہوں تاکہ اپنی صوابدید سے اس مال کو خرچ کریں اور کبھی مسلمان براہ راست خود ہی اپنی صوابدید سے

خرچ کرتے ہوں۔ کن لوگوں میں زکوٰۃ تقسیم کرنی مناسب ہے، اس بارے میں کوئی صراحت نہیں ہوئی تھی۔ زمانہ جاہلیت میں نیک دل، شریف اور مخیر لوگ جس طرح اپنا مال خرچ کیا کرتے تھے، اسی طرح خرچ کرتے رہے تو وہی اسلامی طریقہ بھی رہا۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت کی ہر اچھی چیز کو اسلام برقرار رکھتا بلکہ اس کی تاکید بھی کرتا ہے۔ لفظ زکوٰۃ شروع میں ٹیکس کی بجائے ایسی چیزوں کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس سے ہمارا تزکیہ نفس ہوسکے۔ اس میں اخلاقی عنصر زیادہ ہے۔ سرکاری و قانونی دباؤ اور جبر کا عنصر نہیں۔ جب یہ چیز ذہنوں میں راسخ ہوجاتی ہے کہ دوسرے انسان کی مدد کرنا، غریبوں محتاجوں کا حتی الامکان ہاتھ بٹانا، یہ واجب امر ہے، تو پھر رفتہ رفتہ اس میں اور عناصر بڑھتے جائیں گے۔ مثلاً یہ کہ اس کو کس زمانے میں دیا جائے؟ کس شرح سے دیا جائے؟ اس کے مستحق لوگ کون ہیں؟ یہ مسائل رفتہ رفتہ حل ہوتے جائیں گے۔ چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ مکہ معظمہ میں زکوٰۃ ایک طرح سے رضاکارانہ چیز تھی اور کسی پر کوئی جبر نہیں تھا۔ اس سلسلے میں آپ کو یہ یاد دلاؤں گا کہ زمانہ جاہلیت میں، مشرکوں کے ہاں بھی ایک طرح کی زکوٰۃ پائی جاتی تھی۔ چنانچہ لکھا ہے کہ یہ لوگ اپنی پیداوار کا ایک حصہ اپنے بتوں کو دیتے تھے: کچھ اللہ کے لیے رکھتے تھے، کچھ حصہ بتوں کے لیے، اور پھر قرآن نے سورہ انعام (۶: ۱۳۶) میں طنز کیا ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے بتوں کا کچھ حصہ اللہ کے حصہ میں پڑ جاتا ہے تو اسے لے کر دوبارہ بت کو دے دیتے ہیں۔ لیکن اگر مثلاً ہوا کے چلنے یا کسی اور وجہ سے اللہ کا کچھ حصہ بتوں کے پاس چلا گیا تو اللہ کو نہیں دلاتے، بتوں کے لیے ہی رہنے دیتے ہیں۔ یہ صورت حال مکہ میں رہی۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے مدینہ منورہ تشریف لاتے ہیں تو حالات بدلتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہاں ایک تو مسلمانوں کی تعداد بڑھتی ہے دوسرے مسلمانوں کی ضروریات بڑھتی ہیں، تیسرے مسلمانوں کے دفاع وغیرہ کے لیے مال کی طلب پیدا ہوتی ہے، چوتھے یہ کہ مسلمانوں کے مالی وسائل بھی بڑھ جاتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں بہت سے مالدار مسلمان تھے جو زراعت پیشہ تھے، باغات اور زراعت سے انہیں کافی آمدنی ہوتی تھی اور وہ معین طور پر اس کا کچھ حصہ دے سکتے تھے۔ پانچویں یہ کہ وہاں مسلمانوں کی ایک حکومت بھی قائم ہوجاتی ہے۔ لیکن مدینہ منورہ میں بھی ابتداءً زکوٰۃ گویا ایک خیرات، ایک رضاکارانہ چیز اور ایک غیر معین فریضہ تھا۔ کتنی مقدار میں دیں، کب دیں، کس کو دیں، رفتہ رفتہ ان باتوں کی اہمیت بڑھتی جائے گی، ان سوالوں کا جواب دیا جائے گا اور اس میں وہ عناصر آجائیں گے جن کی بناء پر ہم آخر میں

زکوٰۃ کو آج کل کے ٹیکس سے الگ چیز نہیں سمجھ سکیں گے۔ جس طرح آج کل اگر کوئی شخص ٹیکس دینے سے انکار کرے تو حکومت جبر کرکے اس سے وصول کرتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے ابتدائی زمانہ خلافت میں ہوا کہ انہوں نے منکرینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا اور بالجبر زکوٰۃ وصول کی۔

ایک اور پہلو پر مجھے کچھ روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ جب مسلمان مکے سے ہجرت کرکے مدینہ پہنچے تو عام مہاجرین کی بے روزگاری اور ان کی مصیبت زدگی کا ازالہ کیا گیااور مواخات کے ذریعے سے مدنی مسلمانوں کے خاندانوں میں ان مکی مہاجرین کے خاندانوں کو ضم کرکے ان کے دو خاندانوں کو ایک خاندان بنایا گیا۔یہ خاندان مشترکہ طور پر کمائی کرتے تھےاور رہتے تھے۔اب یہ سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہوگا کہ خود رسول اللہ ﷺ اپنی بسر برد کس طرح کیا کرتے تھےاور آپؐ کے وسائل آمدنی کیا تھے؟ شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک مستشرق جو سویڈن کا ہے لکھتا ہے کہ "ابتداءً مسلمانوں نہایت ہی غریب تھے، لہٰذا لوٹ مار کیا کرتے تھے وہ لکھتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فوجیں بھیجتے تاکہ قافلوں کو لوٹ لیں کیونکہ وہ مجبور تھے اور ان کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں تھی۔" ظاہر ہے کہ اخلاقی نقطہ نظر سے یہ بیان اسلام کے بارے میں بہت سخت اعتراض ہے کہ دوسروں سے تو وہ کہتا ہے کہ انصاف کرو اور اپنے آپ کو ہر چیز کا مجاز سمجھتا ہےلیکن اس اعتراض میں صداقت نہیں، مسلمان مدینہ کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کے پاس گزر اوقات کے وسائل تھے۔ان کی زمینیں تھیں اور وہ زراعت اور باغبانی کرتے تھے۔مکی مہاجرین جو آئے تھے وہ بھی اس کام مشغول ہوگئے۔کچھ لوگ تجارت کرنے لگے، کچھ لوگ جو مثلاً حرفت پیشہ تھے ، جوتے وغیرہ بنانے لگے اور کچھ نجاری و صناعی وغیرہ کرنے لگے۔خود رسول اللہ ﷺ کے متعلق عام طور پر ہماری تاریخی کتابوں کم ذکر ملتا ہے، اس لیے ابتداء میں اس سلسلے میں کچھ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے مدینہ پہنچے تو ابتداء میں شہر کے جنوبی حصہ "قبا" میں قیام فرمایا۔بعض روایات کے مطابق وہ تین ہفتے وہاں مقیم رہے مگر میں ایک مؤرخ کی روایت کو شخصاً ترجیح دیتا ہوں۔وہ صرف چار دن کے قیام کا ذکر کرتا ہے۔دو شنبہ کے دن وہاں پہنچے اور جمعہ کے دن وہاں سے روانہ ہوگئے۔اکثر یہ ذکر آتا ہے کہ جب آپؐ مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو جمعہ کا دن تھا۔ظہر کے وقت رسول اللہ ﷺ نے قیام فرمایااور وہیں راستے میں لوگوں کو باجماعت نماز جمعہ پڑھائی۔اس

کے بعد آپؐ آگے بڑھ کر بنو نجار کی بستی میں پہنچتے ہیں اور وہاں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مکان میں قیام فرماتے ہیں۔وہ اونٹنی کا قصہ وغیرہ جو ذیلی تفصیلیں ہیں مجھے ان سے بحث نہیں ہے۔اس بارے میں یہ امر واضح ہے کہ جب آپ پہلے پہل "قبا" میں پہنچے اور چار دن یا دو تین ہفتے وہاں مقیم رہے تو مقامی لوگوں نے جو مسلمان تھے، نہایت ہی احترام کے ساتھ مہمان نوازی کے طور پر ، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں میں کھانے پینے کی چیزیں پیش کیں۔اس طرح اس مہمان نوازی کی وجہ سے وقت گزر گیا۔اس وقت یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح زندگی گزارتے تھے۔جب آگے بڑھ کر بنو نجار کی بستی میں بستے ہیں تو صحیح بخاری کے مطابق یہ آپؐ کے ننھیال کا گھرانا تھا۔آپ کو معلوم ہوگا کہ عبدالمطلب کی ماں ایک مدنی خاتون تھیں، اور اس طرح رسول اللہ ﷺ کا رشتہ مدینے کے ایک خاندان سے قائم تھا۔تاریخ بتاتی ہے کہ عبدالمطلب کے بعد سے ہر زمانے میں رسول اللہ ﷺ کا خاندان ان رشتہ داروں کے ساتھ اپنے تعلقات کو برقرار رکھتا تھا۔چنانچہ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ جب کبھی شمالی سفر مثلاً مکہ سے شام کو جاتے، تو جاتے وقت بھی اور آتے وقت بھی، مدینہ میں اپنے خاندان کے پاس ٹھہرتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں کے تعلقات دوستانہ اور قریبی تھے۔ان حالات میں صحیح بخاری کے اس بیان پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو نجار کی بستی میں ابو ایوب انصاریؓ کے مکان میں اس لیے قیام فرمایا کہ وہ آپؐ کے ننھیال کا خاندان تھا۔(میں اس اونٹنی کے قصے کا ذکر فی الوقت ترک کرتا ہوں)۔بہرحال عرض کرنا یہ ہے کہ جب ایک قریبی رشتہ دار کے مکان میں رسول اللہ ﷺ قیام فرماتے ہیں تو وہاں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ آپؐ کے وسائلِ زندگی کیا ہیں؟ یقیناً قریبی رشتہ داروں نے آپؐ کی ضیافت کی ہوگی، بغیر اس کا مطالبہ کیے کہ ہمیں اس کے مصارف دیے جائیں۔اسے وہ اپنے لیے باعثِ فخر ہی سمجھتے ہوں گے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر میں مہمان ہیں۔یہ سلسلہ چند مہینے تک جاری رہا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس مقام پر ایک بڑی مسجد بنانے کا حکم دیا۔سارے شہر مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور رسول اللہ ﷺ کی موجودگی کے باعث جو لوگ پہلے محلے والی مسجد میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی اب اس مرکزی مسجد میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے آنے لگے تھے۔چھوٹی مسجد کافی نہیں ہوسکتی تھی، لہٰذا ایک بڑی مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔اس مسجد میں خود رسول اللہ ﷺ کے رہنے کے

لیے چند کمرے بنوائے گئے۔یہ ابتداء میں تو اتنے زیادہ نہیں تھے جو بعد میں نظر آتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ شروع میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک تو آپ ﷺ کی زوجہ حضرت سودہؓ تھیں، اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد دوسری بیوی جن کی شادی ہوچکی تھی لیکن ابھی رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی، تشریف لائیں، یعنی حضرت عائشہؓ، ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ کمرے کی ضرورت تھی۔رسول اللہ ﷺ کی جو دو صاحب زادیاں تھیں، حضرت فاطمہؓ اور حضرت رقیہؓ، ان کے لیے بھی ایک کمرا بنایا گیا۔دونوں بہنیں ایک ہی کمرے میں رہیں۔بعد میں کبھی ان حجروں میں رہنے والوں کی تعداد گھٹے گی۔مثلاً لڑکیوں کی شادیاں ہوجائیں گی۔کبھی ان کمروں کی تعداد نئی بیویوں سے زواج عمل میں آنے کے کے باعث بڑھ جائے گی، بالآخر جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی جب وفات ہوئی تو آپؐ کے ہاں نو بیویاں تھیں اور کنیز ماریہ قبطیہ بھی۔لیکن اس سلسلے میں کچھ توضیحوں کی ضرورت ہے۔جہاں تک حضرت ماریہؓ کا تعلق ہے بہ صراحت بیان کیا گیا ہے کہ مسجد نبوی کے حجروں میں نہیں رہتی تھیں بلکہ کسی قدر فاصلے پر، ان کا علیحدہ مکان تھا۔اسی طرح جہاں تک مجھے اس وقت یاد آرہا ہے۔حضرت صفیہؓ کا مکان علیحدہ تھا، وہ بھی ان حجروں میں نہیں رہتی تھیں۔مسجد نبوی کے ان کمروں میں ایک کمرہ حضرت سودہؓ کے لیے تھا اور ایک کمرہ رسول اللہ ﷺ کی دو صاحب زادیوں کے لیے تھا۔ایک اور کمرہ بنایا گیا تھا، جس میں جلد ہی اس کا مقیم آگیا یعنی حضرت عائشہؓ۔تو ابتداءً تین حجرے رسول اللہ ﷺ کے لیے بنے اور رسول اللہ ﷺ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مکان سے اٹھ کر یہاں آگئے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی بسر برد کا کیا انتظام تھا۔لکھا ہے کہ مدینہ کے جو انصار کسان تھے اور زراعت پیشہ تھے، ان میں سے اکثر نے جو کافی مالدار تھے، اپنے باغوں میں ایک ایک درخت کو نشان زدہ کردیا تھا کہ اس کا پھل رسول اللہ ﷺ کے لیے ہوگا۔رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے انہوں نے ایسا کیا تھا، اور سال کھجور کی فصل کٹنے پر، اس درخت سے جتنی کھجوریں حاصل ہوتیں، وہ سب رسول اللہ ﷺ کے گھر پہنچا دی جاتیں۔اگر وہ آپؐ کی ضرورت سے زائد ہوتیں تو غرباء اور مہمانوں میں تقسیم ہوتیں۔یہ پیش کش برابر جاری رہی۔ہمارے مؤرخ اور محدث اکثر حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث کا ذکر کرتے ہیں کہ بعض اوقات مہینے گزرجاتے اور ہم صرف دو چیزوں پر اکتفاء کرتے تھے یعنی کھجور اور پانی پر، ہمارے گھر چولہا نہیں جلتا تھا۔اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ غالباً اس زمانے کا ذکر

ہے جب رسول اللہ ﷺ کے وسائل آمدنی میں صرف کھجوریں ہوا کرتی تھیں۔رفتہ رفتہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ان کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔اس سلسلے میں ہمیں چیز اور تفصیلیں نظر آتی ہیں مثلاً اس کا پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چند بکریاں خریدی تھیں اور ان کا دودھ خاندان میں خرچ ہوتا تھا۔اسی طرح اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ بعض اوقات بعض لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کوئی اونٹنی، کوئی بکری جو دوددھ دینے والی ہوتی پیش کرتے اور التجاء کرتے کہ اس کو قبول فرمایئے، اس طرح ہماری عزت افزائی ہوگی۔تو کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ اس کو قبول فرمالیتے تھے۔اس طرح ان کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔شروع میں مثلاً ایک بکری تھی، بعد میں دس بکریاں ہوگئیں۔شروع میں ایک اونٹنی تھی بعد میں چار اونٹنیاں ہوگئیں۔اب ان کے لیے ہمیں تفصیل سے پتا چلتا ہے کہ شہر مدینہ کے مضافات میں ایک چراگاہ معین کی گئی جہاں ایک صحابی رضاکارانہ طور پر ان جانوروں کی نگہداشت کرتے، انہیں چرانے کا فریضہ سرانجام دیتے اور روزانہ دودھ اس مقام سے مدینہ لا کر رسول اللہ ﷺ کے ہاں پہنچایا کرتے تھے۔اہل خاندان اس دودھ کو استعمال کرتے تھے۔اسی طرح حضرت سعد بن عبادہؓ جو بنی نجار ہی کے ایک فرد اور رسول اللہ ﷺ کے قریبی ننھیالی رشتہ دار تھے، ان کی عادت تھی کہ روزانہ اپنے گھر میں پکی ہوئی چیزوں میں سے کوئی نہ کوئی چیز رسول اللہ ﷺ کے مکان پر بھیجتے۔وہ بہت مالدار شخص تھے۔بعض وقت جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے کہ یہی ایک صحابی اسی اصحابِ صفہ کو بیک وقت اپنے گھر لے جاکر ان کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔رسول اللہ ﷺ کھانے کے اوقات میں تنہا کھانا کھانا کبھی پسند نہ فرماتے۔ہر وقت دس پانچ لوگوں کو جو اس وقت موجود ہوتے، بلا لیتے۔ کبھی کچھ گھر کی چیزیں کھجور وغیرہ، کچھ وہ تحفے جو روز بروز آتے تھے، وہ بھی کھانے کے طور پر استعمال ہوتے۔اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا۔جلد ہی ایک چھوٹے سے ذریعہ آمدنی کا اضافہ ہوتا ہے۔۲ ہجری رمضان کے مہینے میں دشمنوں کے ساتھ جنگوں کا آغاز ہوتا ہے۔جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جنگ کے مال غنیمت کا (۵/۱) حصہ حکومت کے لیے وقف تھا اور (۵/۴) حصہ مجاہدوں میں برابر تقسیم کیا جاتا ہے۔بیش تر جنگوں میں رسول اللہ ﷺ شخصاً شریک ہوئے۔مثلاً بدر میں اور اس کے بعد مختلف غزوات میں۔اس وقت رسول اللہ ﷺ کے لیے دو طریقے سے آمدنی ہونے لگی، ایک تو مجاہد کی حیثیت سے کہ آپ جنگ میں شریک تھے اور جنگ میں شریک ہونے والوں کی طرح برابر حصہ ملتا جس کی

مقدار گھٹتی بڑھتی رہتی۔اس وقت ایسا نہیں تھا کہ مستقل ہر مہینے جنگ ہو اور ہمیشہ مال غنیمت سے کافی آمدنی ہوتی رہتی ہو۔دوسرا وسیلہ اس مال غنیمت میں سرکاری مال تھا جسے رسول اکرم ﷺ کی صوابدید پر چھوڑا گیا تھا کہ جس طرح چاہیں آپ تقسیم فرمائیں۔لیکن وہ آپؐ کے خاندان کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا، بلکہ عوام الناس کی ضروریات کے لیے اور ملکی عام بہبود، دفاعی انتظام، ہتھیاروں کی خریداری کے لیے خرچ ہوتا تھا۔بہرحال اگر رسول اللہ ﷺ چاہتے اور کسی وقت آپ کے مکان میں کوئی چیز نہ ہوتی تو اس سرکاری مال یعنی خزانے کی چیزوں میں سے مہیا کر دی جاتی۔لیکن یہ صرف مال غنیمت کے متعلق ہے۔جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے، اس کے بارے میں شریعت کا یہ حکم تھا کہ زکوٰۃ کا مال رسول اللہ ﷺ کی ذات اور رسول اللہ ﷺ کے اہل و عیال اور قبیلہ بنی ہاشم اور قبیلہ بنی المطلب کے لیے حرام ہے۔ اگر سرکاری آمدنی حکمران کی آمدنی سمجھ لی جائے تو حکمران کے قریبی لوگ، ماتحت لوگ، ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اگر معلوم ہو کہ حکمران کے لیے یہ حرام ہے تو ماتحت افسروں کو ذرا احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کہ حکمران ان کا محاسبہ کرے گا۔اس لحاظ سے یہ نہایت اہم بات ہے کہ اسلام کے سوا دنیا کی اور کسی قوم نے سرکاری آمدنی حکمران کی ذات کے لیے ممنوع قرار نہیں دی۔یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔اس عام حکم میں کہ جو مال دشمن کافروں سے، غیر مسلموں سے،مال غنیمت کے طور پر حاصل ہو، اس کا ایک حصہ رسول اللہ ﷺ کے لیے خرچ کیا جا سکتا ہے۔" قُلِ ٱلْأَنفَالُ لِلَّهِ وَٱلرَّسُولِ " (۸:۱) کے جو الفاظ آئے ہیں وہ صرف مالِ غنیمت کے متعلق ہے" وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَىْءٍ" اور مال غنیمت کا کچھ حصہ اگر رسول اللہ ﷺ چاہتے تو آپؐ اپنی ذات پر خرچ کرسکتے تھے۔لیکن زکوٰۃ کا کوئی حصہ بھی رسول اکرم ﷺ اور آپ کے خاندان کے لیے صرف نہیں کیا جاسکتا تھا۔بہرحال میں عرض کررہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ بالکل ابتداء میں، مدینہ میں، یہی صورت حال تھی۔مکہ کا سوال نہیں کیونکہ یہاں پر آپؐ کی وراثتی جائیداد تھی، اپنی بیوی سے حاصل کردہ جائیداد تھی، آپؐ خود بھی تاجر تھے۔مدینہ میں ہمیں یہ صورت نظر نہیں آتی۔ہم دیکھتے ہیں کہ شروع میں آپؐ مدینہ میں مہمان رہے اس کے بعد آپ کو ایسی چیزیں تحفتاً پیش کی گئیں جو مستقل تھیں، مثلاً کھجوروں کی فصل کے وقت اس کا کچھ حصہ آپؐ کے پاس آتا۔اس کے بعد مالِ غنیمت ایک ذریعہ پیدا ہوا، جو رسول اللہ ﷺ، جو رسول اللہ ﷺ کے گزر بسر کے انتظام میں کام آنے لگا۔جنگِ بدر

کے بعد جلد ہی جنگ احد پیش آئی(کم و بیش ایک سال بعد)۔اس موقع پر ہمارے مؤرخ ذکر کرتے ہیں کہ وہاں "مخریق" نامی ایک یہودی تھا۔کہتے ہیں کہ مسلمان ہوچکا تھا۔اپنی انتہائی عقیدت کے پیشِ نظر اس نے وصیت کی تھی کہ اگر جنگ میں مر جاؤں تو میرے سارے باغ جو مدینہ میں ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کے ہوں گے۔چنانچہ مخریق کے سات باغ تھے جن کی پوری آمدنی اب رسول اللہ ﷺ کے لیے مخصوص ہوگئی۔اس طرح ابتدائی زمانے کی دشواریاں ختم ہوگئیں۔ہمیں اور چند چیزوں کا ذکر بھی ملتا ہے مگر میں ان تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔

میں نے ابھی آپ سے بیان کیاکہ حکومت کی طرف سے ایک قانون بنا کہ سارے مالدار مسلمان، اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کریں۔اس سلسلے میں ابتداءً خیرات کا حکم دیا گیا اور یہی خیرات بعد میں ٹیکس بن گئی۔اس سلسلے میں مجھے مکرر ذکر کرنا پڑتا ہے کہ مالِ غنیمت کی آمدنی کا ایک حصہ حکومت کے لیے ہوتا تھا اور مالِ غنیمت کا ۱/۵ حصہ اور "مال فئے" پورے کا پورا حکومت کے تصرف میں آجاتا۔ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اگر دشمن سے لڑائی ہو اور جیسا کہ قرآن (۵۹: ٦) کے الفاظ ہیں گھوڑوں کے دوڑانے کے ذریعے دشمن کے علاقے پر دشمن کے مال پر قبضہ کیا گیا ہو، تو اسے مالِ غنیمت قرار دیا جاتا۔اگر جنگ کے بغیر دشمن قبول کرتا کہ ہم آزاد تو رہیں گے لیکن تمہیں اس قدر سالانہ خراج دیا کریں گے۔وغیرہ، یہ ساری آمدنیاں "فئے" کہلاتی تھیں۔ان کو تقسیم کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔وہ سارے کا سارا سرکاری خزانے میں آجاتا۔حکومت کی ان دو آمدنیوں کے ساتھ ساتھ اب ہم زکوٰۃ کو لیں گے جس کے اصول یہ ہیں کہ اگر کسی شخص کے پاس اس کی ضرورتوں سے فالتو کچھ رقم ہواور وہ رقم سال بھر اس کے قبضہ میں ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔یہ نہیں کہ مثلاً آج تو ہمارے پاس اپنی ضرورتوں سے فاضل ایک لاکھ روپے ہیں۔لیکن چند دنوں، چند مہینوں یا چندہفتوں کے بعد وہ رقم ہماری ضرورتوں کے لیے خرچ ہوگئی۔اسے فالتو رقم نہیں کہا جاسکتا۔اسلامی قانون یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس معینہ نصاب کی رقم یعنی Minimum سے اونچی رقم کم از کم ایک سال تک موجود رہے تو اسے اس کا ڈھائی فیصد زکوٰۃ کے نام سے حکومت کو دینا ہوگا۔اس میں کچھ تفصیلات کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔ساری زکوٰۃ ڈھائی فیصد نہیں ہے۔مختلف چیزوں کی زکوٰۃ مختلف ہے۔مثلاً ایک شخص کے پاس روپیہ ہے، یا سونا اور چاندی ہے۔ ان پر ڈھائی فیصد ہے، سالانہ دینا پڑتا ہے۔لیکن اگر کوئی شخص زراعت کرتا ہے تو فصل کٹنے کے بعد جو مقدار حکومت

کے سپرد کی جاتی ہے اسے زکوٰۃ الارض کہتے ہیں۔زکات ہی کے نام سے ہم اس چیز کو موسوم کرتے ہیں جو آج کل مال گزاری کہلاتی ہے۔یہ کٹی ہوئی فصل کا دسواں حصہ ہوتا ہے۔اسی طرح کسی شخص کے پاس سونے کی کان ہو، یا چاندی کی کان تو اس سے بھی اس کوایک حصہ حکومت کی خدمت میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ان تمام کی شرحیں مختلف ہیں۔اسی طرح کسی کے پاس جانور ہوں مثلاً بکریاں، گائے، بیل، بھینس یا اونٹ وغیرہ تو ان کی بھی ایک تعداد معین تھی کہ اس سے زیادہ کسی کے پاس ہوں تو ہر سال اس کا اتنا حصہ حکومت کو دیا کرے گا۔بکریوں کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک فیصد لیا جاتا تھا۔مثلاً کسی کے پاس پانچ سو بکریاں ہوں تو وہ پانچ بکریاں دیتا، کسی کے پاس چار سو بکریاں ہوں تو وہ چار بکریاں دیتا تھا۔عام طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اونٹوں کی شرح اور گائے کی شرح اس سے کسی قدر زیادہ پیچیدہ ہے۔مثلاً پانچ اونٹوں پر ایک بکری دیں یا دس اونٹوں پر فلاں دیں یا بیس اونٹوں پر ایک اونٹ دیں وغیرہ۔بعض وقت ہمیں ایک اور ذریعہ آمدنی بھی نظر آتا ہے۔وہ زکوٰۃ التجارت ہے، یعنی تجارت کی زکوٰۃ، اسی طرح زکوٰۃ المعدن یعنی معدنیات کی زکوٰۃ غرض مختلف چیزوں پر جو ٹیکس مسلمان اپنی حکومت کو دیتے وہ سب زکوٰۃ کے نام سے موسوم ہوتے اور ان کی شرح مختلف ہوتی۔اس کے متعلق زیادہ تفاصیل میں گئے بغیر مجھے ایک چیز کی طرف اشارہ کرنا ہے، وہ بھی اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔اسلام سے پہلے کے مذہبوں میں سرکاری آمدنی کے ذرائع یعنی کن کن چیزوں پر ٹیکس لیا جائے، اس کی تفصیل تو ہمیں ملتی ہے مثلاً توریت وغیرہ میں۔لیکن کنکن مدات میں انہیں خرچ کیا جائے اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔وہ بالکل حکمران کی صوابدید پر ہوتا ہے کہ اس ٹیکس کو وہ جیسا چاہے خرچ کرے اور عام طور پر حکمران اپنی ذات پر اور اپنی فضول خرچی اور عیاشی پر خرچ کیا کرتے تھے۔میرے علم میں قرآن کریم وہ پہلی دینی کتاب ہے جس میں آمدنی کے وسائل کے متعلق بہت کم تفصیلیں ملتی ہیں، لیکن خرچ کے متعلق انتہائی تفصیل سے بتایا جاتا ہے کس کو کتنی رقم دی جائے۔مثلاً "وَءَاتُوا۟ حَقَّهُۥ يَوْمَ حَصَادِهِ" (۶:۱۴۱)اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زراعت پر زکوٰۃ دینی چاہیئے۔لیکن صرف لفظ 'حق' ہے، یہ نہیں بتایا کہ کس مقدار میں عشر ۱/۱۰ یا ڈھائی فیصد یا پچاس فیصد۔ایسی تفصیلات قرآن میں نہیں ملتیں۔یہ تفصیلیں ہمیں حدیث میں ملیں گی۔لیکن قرآن کا یہ اصول نظر آتا ہے کہ آمدنی کے ذرائع کے متعلق زیادہ تفصیل نہ دے بلکہ اگر میری توجیہ (Interpretation) صحیح ہے تو قرآن اسے حکومت کی صوابدید پر

چھوڑ دیتا ہے کہ حسبِ ضرورت اس میں اضافہ و تخفیف کرسکے۔ جن چیزوں کا قرآن میں ذکر ہے (مثلاً زراعت پر ٹیکس، تجارت پر ٹیکس وغیرہ) ان کے علاوہ بھی کسی اور چیز پر ہم ٹیکس لے سکتے ہیں، مثلاً اگر کسی مقام پر مچھلیاں بہت ہوں یا کسی مقام پر شہد کی مکھیوں سے تجارتی پیمانے پر آمدنی ہونے لگے تو اس کا ایک حصہ حکومت کو دیں۔ یہ ساری چیزیں زکوٰۃ بن جاتی ہیں۔

زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلے میں صاف اور واضح قرآنی احکام ہیں۔ وہ مشہور و معروف آیت جو کہ سورہ توبہ میں ہے "إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَٱلْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَٱلْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِى ٱلرِّقَابِ وَٱلْغَٰرِمِينَ وَفِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ ٱللَّهِ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ " (۹:۶۰) صدقات (یعنی حکومت کی آمدنیاں یا زکوٰۃ) کو تقسیم کیا جائے فقراء پر، مساکین پر، اس کے بعد ذکر ہے "والعاملین علیھا" یعنی حکومت کے ان کارندوں پر جو زکوٰۃ کے کام میں مشغول ہیں۔ عاملین کے بعد ذکر آیا ہے "والمؤلفة قلوبھم" یعنی ان لوگوں پر جن کا دل موہ لینے کی تمہیں ضرورت ہے (تبلیغِ اسلام کے لیے) مثلاً جیسے آج کل ہم کہتے ہیں Secret Service حکومت مخفی طور پر ملت اور مملکت کے مفاد میں لوگوں پر کچھ رقم خرچ کرتی ہے۔ اس کے بعد ایک لفظ ہے "وفی الرقاب" گردنوں کو چھڑانے کے لیے۔ اس کے معنی متفقہ طور پر دو لیے جاتے ہیں۔ ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے اور اسلامی مملکت کی مسلم اور غیر مسلم رعایا اگر دشمن کے ہاتھ میں قید ہوگئی ہو تو فدیہ دے کر انہیں رہائی دلانے کے لیے۔ زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلے میں اس کے بعد ایک لفظ ہے۔ "غارمین" اس کے معنی ہیں وہ کھاتے پیتے مالدار لوگ جن پر یکایک کسی حادثے یا خسارے سے سخت مالی بوجھ پڑجاتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے میں نے سہواً کسی آدمی کو قتل کردیا۔ مجھے خون بہا دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن میں محتاج اور تہی دست ہوں۔ تو حکومت کا فریضہ ہے کہ میری مدد کرے تاکہ میں متضرر کے متعلق اس فریضہ کی انجام دہی سے سبکدوش ہوسکوں۔ یہ ہے غارمین۔ اس کی ابھی میں مزید تشریح کروں گا۔ اس کے بعد ایک لفظ ہے "فی سبیل اللہ" یعنی اللہ کی راہ میں۔ حیرت ہوتی ہے کہ فی سبیل اللہ کے اولین معنی لیے گئے ہیں۔ دفاعی خدمات، ملک کی حفاظت کا انتظام اور فوج کے اخراجات، مسجدیں وغیرہ بنانے کو ثانوی حیثیت دی گئی۔ اس کے بعد

ایک اور لفظ ہے جس کی توقع عام حالات میں نہیں تھی مگر اس کا ذکر یہاں ملتا ہے۔"ابن السبیل" اس کے لفظی معنی ہیں راستے کا بچہ اور مراد اس سے ہے مسافر۔ مسافر کسی مقام کا بھی ہو اگر ہمارے علاقے سے گزرتا ہے تو آج کل حکومتیں تو مسافر سے ٹیکس لیتی ہیں کہ ہمارے ملک میں کیوں آتے ہو۔ اسلامی قانون کا حکم یہ ہے کہ مسافروں کی مہمان نوازی کرو، انہیں کھلاؤ پلاؤ اور اقامت کی سہولتیں مہیا کرو۔ ان آٹھ مدات کے ذکر کے بعد قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ اللہ کا مقرر کردہ حکم ہے "فریضة من اللہ"۔ دوسرے الفاظ میں حکومت کے موازانہ (میزانیہ، Budget) پالیسی متعین کردی گئی کہ ان آٹھ مدات میں زکوٰۃ کی آمدنی سے رقم صرف کی جائے: فقراء، مساکین، عاملین علیھا، مؤلفة القلوب، الرقاب، غارمین، فی سبیل اللہ، ابن السبیل۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی دلچسپ چیز کا میں ذکر کرتا ہوں۔ امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ چونکہ آٹھ مدات میں رقم خرچ کرکے کا حکم ہے لہٰذا آمدنی کا ۱/۸ حصہ ہر ایک مد کو دلایا جائے۔ (دوسرے آئمہ کی رائے یہ نہیں ہے) ابتدائی دو نام فقراء و مساکین سے کیا مراد ہے؟ بظاہر دونوں مترادف لفظ ہیں مگر اس میں اختلاف رائے رہا ہے۔ اور اس اختلاف رائے کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوا تھا تو امام شافعیؒ نے کہا، چونکہ اللہ نے آٹھ مدوں میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ نے اپنے وفورِ رحمت سے غریبوں کو دگنا حصہ دلانا چاہا، اس لیے دو نام استعمال کیے گئے ہیں۔ (۱/۸) فقراء کے لیے اور (۱/۸) مسکینوں کے لیے یعنی دونوں غریبوں کے لیے کہ بجائے (۱/۸) کے (۱/۸) یا ایک چوتھائی آمدن ان لوگوں کے لیے خرچ کی جائے۔ یہ محض علمی بحث کے سلسلے میں، میں نے آپ سے بیان کیا ہے۔ ایک چیز بہت زیادہ اہم ہے۔ آج کل اگر ہم اپنی فقہ کی کتابوں کو کھولیں تو ان میں نظر آئے گا کہ زکوٰۃ صرف مسلمانوں کو دی جاسکتی ہے غیر مسلموں کو نہیں دی جاسکتی۔ ہمیں نظر آتا ہے انتہائی ابتدائی زمانۂ اسلام میں، انتہائی مقدس اور قابلِ احترام ہستیوں کی یہ رائے نہیں تھی۔ چنانچہ امام ابو یوسف کی تالیف "کتاب الخراج" میں اگر ہم دیکھیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے زمانے میں زکوٰۃ کی آمدنی سے یہودیوں کی بھی مدد فرماتے تھے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک روز وہ مدینہ کی گلیوں سے گزر رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص بھیک مانگ رہا ہے۔ انہیں حیرت ہوئی کہ میرے زمانے میں لوگ بھیک مانگیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ حکومت کا فریضہ ہے

کہ غریبوں کی مدد کرے۔ انہیں کھلائے پلائے۔ اس سے پوچھتے ہیں تو کون ہے؟ وہ کہتا ہے میں ایک یہودی ہوں۔ اب تک کاروبار کیا کرتا تھا اور جزیہ دیا کرتا تھا۔ اب بوڑھا ہوگیا ہوں کام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا مجبور ہوں کہ بھیک مانگوں، تو حضرت عمرؓ بے حد متاثر ہوئے اور فوراً اپنے افسر خزانہ کو حکم دیا کہ اس یہودی سے آئندہ جزیہ نہ لیا جائے گا۔ بلکہ مزید برآں اس کے لیے روزینہ مقرر کردیا جائے۔ ان کے الفاظ ہیں کہ ھذا مساکین اھل الکتاب یہ مساکین کی مد میں آتا ہے اس لیے زکوٰۃ سے اس کو رقم دی جائے۔ دوسرے معنی میں حضرت عمرؓ کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے اور دیگر بعض صحابہ مثلاً! زید بن ثابت، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما وغیرہ کی رائے مماثل ہونے کا ذکر طبری نے کیا ہے کہ زکوٰۃ غیر مسلموں کو دی جا سکتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ "فقراء" سے مراد مسلمانوں کے فقیر اور مساکین سے غیر مسلم رعیت کے فقیر ہوں گے۔ جو بھی ہو یہ پہلی مد ہے۔ والعاملین علیھا تیسری مد ہے۔ اگر میں یہ توجیہ کروں کہ اس سے مراد پوری سول ایڈمنسٹریشن ہے تو حیرت کی بات نہ ہو گی۔ کیونکہ زکوٰۃ کو جمع کرنے والے، زکوٰۃ کا حساب رکھنے والے، زکوٰۃ کے حساب کی جانچ پڑتال یا آڈٹنگ (Auditing) کرنے والے، زکوٰۃ کو تقسیم کرنے والے، تقسیم کی نگرانی کرنے والے، یہ سب لوگ عاملین میں آ جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوری سول ایڈمنسٹریشن یعنی سرکاری ملازمین کی تنخواہ زکوٰۃ کی آمدنی سے دی جائے گی۔

اس کے بعد کا لفظ ہے۔ "مولفہ قلوبھم" اس سلسلے میں ایک بہت ہی مشہور کتاب ہے۔ ابویعلی الفرا الحنبلی، جیسے کٹر قسم کے عالم کی۔ کٹر کا لفظ میں اچھے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں کہ وہ کسی ذاتی غرض یا کسی سیاسی ضرورت کے تحت دبنے والے انسان نہیں تھے۔ کھری کھری بات سناتے تھے۔ ان کی ایک کتاب ہے۔ "الاحکام السلطانیہ" یہ ماوردی کے معاصر ہیں اور موردی کی کتاب ہی کے نام سے یہ کتاب انہوں نے لکھی ہے اور میں زکوۃ کی مدات پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "مؤلفۃ قلوبھم" یعنی جن لوگوں کا دل موہ لینا ہے ان کی چار قسمیں ہیں۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی مدد کریں۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جائے کہ وہ مسلمانوں کو مضرت پہنچانے سے باز رہیں۔ عام حالات میں وہ مسلمانوں کو

نقصان پہنچا سکتے ہیں لیکن اگر ان کو رقم دے دیں تو مثلاً جنگ کے زمانے میں وہ غیر جانبدار رہیں گے، مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تیسری قسم، ابویعلیٰ الفراء لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جائے کہ وہ اسلام قبول کرلیں۔ چوتھی قسم، وہ کہتے ہیں، ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے ان کے قریبی رشتہ دار، ان کے قبیلے کے لوگ، ان کے خاندان کے لوگ اسلام قبول کرلیں۔ اس فہرست کے بعد وہ ایک جملے کا اضافہ کرتے ہیں کہ یہ رقم مسلمان اور غیر مسلم کسی کو بھی دی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کی تالیفِ قلب کرنی ہو یا کسی کو، مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچانے کے لیے رقم دی جانی ہو۔ تو وہ غیر مسلم ہی ہو گا۔ لیکن امام ابو یعلی صراحت سے کہتے ہیں کہ "وہ چاہے غیر مسلم ہویا مسلم، اس کو مؤلفۃ قلوبھم کے تحت زکوٰۃ کی آمدنی سے رقم دی جاسکتی ہے۔"

اس سے آگے چلئے "فی الرقاب" یعنی ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے بھی حکومت امداد کرے اور ملک کی رعایا کو، دشمن کی قید سے چھڑانے کے لیے بھی حکومت زکوٰۃ صرف کرے۔ اس سلسلے میں مجھے یاد آرہا ہے "طبقات ابن سعد" میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے متعلق کچھ تفصیلی حالات دے کر ان کا خط نقل کیا گیا ہے۔ وہ خط انہوں نے گورنر یمن کے نام لکھا ہے۔ اس خط میں لکھتے ہیں کہ جتنی رعایا دشمن کے ہاتھ قید میں ہو، اس کو چھڑانے کے لیے سرکاری خزانے سے رقم خرچ کی جائے، اس صراحت کے ساتھ کہ چاہے وہ مسلمان ہو یا ذمی۔ تو گویا رقاب کے سلسلے میں اسلامی رعیت کو دشمن کی قید سے رہائی دلانے کے لیے جو فدیہ دیا جاتا ہے، اس میں بھی مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز نہیں ہے۔ جس طرح فقراء اور مساکین کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کی رائے میں زکوٰۃ کی رقم سے غیر مسلم کی مدد کی جاسکتی ہے۔ مولفۃ قلوبھم کے سلسلے میں بھی ہم دیکھ چکے ہیں، اسی طرح رقاب کے سلسلے میں بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ زکوٰۃ غیر مسلموں پر خرچ کی جاسکتی ہے۔

"غارمین" کا لفظ جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ذکر کیا تھا، کسی شخص پر رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں غیر معمولی بوجھ پڑ جائے اور وہ اس سے عہدہ بر آ نہ ہو سکے۔ ہمارے مولف مثالیں دیتے ہیں کہ مثلاً اس کا مال راستے میں چوری ہو گیا یا اس کا مال طغیانی میں، کسی زلزلے میں یکایک ضائع ہو گیا وغیرہ وغیرہ، ایسی حالتوں میں اس بظاہر مال دار

شخص کی بھی ہم مدد کر سکتے ہیں کیونکہ وہ اچانک، عارضی طور پر محتاج ہو گیا ہے۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ، بظاہر اس لفظ غارمین سے استنباط کر کے ایک نئی چیز کا ہمیں اضافہ نظر آتا ہے اور وہ سرکاری خزانے سے لوگوں کو امداد نہیں بلکہ قرض دینا ہے۔کوئی شخص کھاتا پیتا ہے، اس کو امداد کی ضرورت نہیں لیکن اس کو مال کی ضرورت ہے ، مثلاً تجارت کے لیے یا کسی اور کام کے لیے تو حکومت اس کو قرض دیتی ہے اور قرض ظاہر ہے کہ بلاسود ہی ہو گا کیونکہ حکومت ہی وہ ادارہ ہے جو سود کی آمدنی کا خیال کیے بغیر، رعایا ہی کی آمدنی، رعایا ہی کو قرض دے سکتی ہے۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طرز عمل یہی نظر آتا ہے کہ وقتاً فوقتاً وہ لوگوں کو سرکاری خزانے سے بلاسود قرضے دیتے۔اس سے خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ان کی آمدنی کم تھی، ان کی تنخواہ کم تھی، کبھی کبھی انہیں ضرورت پیش آتی تھی تو وہ سرکاری خزانے سے قرض لیتے تھے۔بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ماہ تنخواہیں نہیں بنتی تھیں، بلکہ چھ ماہ میں ایک بار۔تو اپنی تنخواہ کے ملنے پر وہ ادائیگی کر دیتے۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح اور لوگوں کو بھی اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔لفظ "غارمین" سے یہ بھی استنباط کیا گیا تھا۔

"فی سبیل اللہ" کے متعلق ابھی میں نے ایک حد تک اشارہ کر دیا ہے کہ اس سے مراد فوجی انتظام اور دفاع کا اہتمام ہے۔سول ایڈمنسٹریشن کا ذکر ہم "عاملین علیھا" کے تحت دیکھ چکے یں۔"فی سبیل اللہ" کے تحت پوری ملٹری ایڈمنسٹریشن آ جاتی ہے۔سپاہیوں کی تنخواہ کی ادائیگی، اسلحہ کی فراہمی اور دیگر فوجی ضروریات سب اس مد کے تحت آ جاتی ہیں۔نیز اور چیزین بھی مثلاً مسجدوں کا بنانا، کارواں سرائے تعمیر کرنا، مدرسوں کی تعمیر وغیرہ یہ ساری چیزیں جی سبیل اللہ کے تحت، اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے تحت آ جاتی ہیں۔

آخری چیز "ابن السبیل" راستے کا بچہ یعنی مسافر جو گزر رہے ہیں، اس کی طرف بھی میں نے اشارہ کیا اور میں گمان کرتا ہوں کہ اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہوتی تھی۔کوئی غیر مسلم کسی مقام سے گزرے،

مثلاً وہاں سب مسلمان ہوں تو اس کی مہمان نوازی اور اس کی ضرورتوں کا انتظام کرنا یہ حکومت کے فرائض میں داخل تھا اور میں اس کو اور بھی زیادہ توسیع دے کر کہہ سکتا ہوں کہ ابن السبیل کے معنی پورے Tourist Traffic کا انتظام ہے۔اس میں سڑکوں کا بنانا، پلوں کی تعمیر، اس میں پولیس کا انتظام کرنا کہ گزرنے والوں کی جان و مال محفوظ رہے۔اسی طرح بازاروں کی نگرانی کہ وہاں پر دغا اور فریب نہ ہو، غذا صحت کے لیے مضر نہ ہو، وغیرہ وغیرہ، یہ سب ابن السبیل کے لفظ کے تحت آ جائیں گے۔یہ ایک تاثر ہے جو اس آیت کو پڑھنے سے اور اس آیت کے متعلق ہمارے پرانے مفسرین کی آراء کو معلوم کرنے سے پیدا ہوا ہے۔میں جانتا ہوں اور اس کا اعتراف بھی کرتا ہوں کہ آج کل ہمارے فقہاء یہ رائے نہیں رکھیں گے اور وہ کہیں گے کہ زکوٰۃ غیر مسلموں کو نہیں دی جا سکی۔انہیں اختیار ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفہ، یہودیوں اور عیسائیوں کی زکوٰۃ کی مد سے امداد کیا کرتے تھے۔ایک یہودی کا بھی میں نے ذکر ہے کہ کہ امام ابو یوسف کی "کتاب الخراج" کے مطابق مدینہ میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔بلاذری نے لکھا ہے کہ شام کے سفر کے دوران حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زکوٰۃ کی مد سے غریب اور محتاج عیسائیوں کی مدد کرنے کا حکم دیا۔ابو عبید کی "کتاب الاموال" فقرہ 1996۔1997 کے مطابق رمضان کی عید کا صدقہ فطر بھی عیسائی راہبوں کو بھی دیا جاتا رہا ہے۔

سوال اس وقت یہ پیدا ہوتا ہے کہ زکواۃ کا جو تصور آج کل ہمارے ذہنوں میں ہے کہ ہر شخص اپنی بچت سے سال کے اختتام پر ڈھائی فی صد رقم غریبوں کو بطور زکوٰۃ دیا کرے، یہ تصور کب پیدا ہوا ہے، جب کہ عہدی نبوی میں زکوہ حکومت وصول کرتی تھی۔حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں مرتدین سے جو جنگ ہوئی وہ اسی زکوٰۃ کی وصولی کے سلسلے میں تھی۔لوگ زکوٰۃ حکومت کو دینا نہیں چاہتے تھے۔حضرت ابوبکر نے تلوار کے زور سے لوگوں کو مجبور کیا کہ انہیں زکوٰۃ حکومت ہی کو ادا کرنی ہو گی۔اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرق کیسے پیدا ہوا؟ تاریخ کی کتابوں میں اس کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ اس کا تعلق حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد سے ہے۔آپ کو معلوم ہو گا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں۔(ستائیس ہجری کا میں معین طور پر ذکر کرتا ہوں کہ) اسلامی فوجیں ایک طرف یورپ، اندلس اور افرنجہ میں پہنچ گئی تھیں(افرنجہ سے مراد غالباً فرانس ہو گا۔"اندلس اور افرنجہ" کے الفاظ

طبری نے بیان کیے ہیں) دوسری طرف ستائیس ہجری میں مسلمانون کی فوجیں جیحوں کو عبور کر کے ماوراء النہر تک پہنچ جاتی ہیں یعنی چین کی سرحد تک۔گویا اسلامی حکومت رسول اللہ ﷺ کی وفات کے صرف پندہ سال بعد تین براعظموں، یورپ، افریقہ اور ایشیا میں پھیل جاتی ہے۔اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی، آبادی کی اکثریت غیر مسلم تھی۔ فتوحات نئ نئ ہوئی تھیں۔توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ سب لوگ راتوں رات مسلمان ہو جائیں گے۔میرا اپنا گمان ہے کہ اس وقت ایک سو مربع میل میں ایک سے زاید مسلمان نہیں ہوتا ہو گا۔ان حالات میں یہ میرا اندازاہ (میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں) کہ اگر اس زمانے میں زکوٰۃ کی وصولی کے لیے، ہر ایک مسلمان کے مکان پر کارندے جاتے، اس سے حساب مانگتے کہ تمہیں کتنی آمدنی ہوئی، کتنا خرچ ہوا، کتنی رقم سال بھر باقی رہی، تو تین براعظموں میں اس کام کے لیے کثیر عملے کی ضرورت ہوتی۔میرا اندازہ ہے کہ مصارف زیادہ ہوتے اور آمدنی اس سے کم ہوتی۔ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وزیر مالیہ (فنانس) نے مشورہ دیا ہو گا کہ اس رقم کو مسلمانوں پر ہی چھوڑ دیا جائے۔انہیں معلوم ہے کہ زکوٰۃ فرض ہے۔اللہ کا فرض کیا ہوا امر ہے اس لیے ان لوگوں کے ضمیر پر چھوڑ دیجیے۔ان سے کہہ دیا جائے کہ وہ ہر سال زکوٰۃ کی رقم خود ہی قرآنی احکام کے مطابق تقسیم کر لیا کریں اگر حکومت اس کے انتظام کو بدستور اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی تو سرکاری عملے کے اخراجات اتنے بڑھ جاتے کہ اس بار گراں کو کوئی عقل مند وزیر مالیہ قبول نہ کر سکتا بہرحال ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں طے کیا گیا کہ زراعت کی زکوٰۃ، معدنیات کی زکوٰۃ اور فلاں فلاں چیزوں کی زکوٰۃ تو بدستور حکومت ہی لے گی لیکن نقد رقم کی زکوٰۃ سونا چاندی، درہم اور دینار، اس کو مسلمان اپنی ہی ذاتی صوابدید پر اپنے ضمیر کے فیصلے کے مطابق ہر سال تقسیم کر دیا کریں۔نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہم بھول گئے کہ زکوٰۃ کے معنی عہد نبوی میں اور خلافت راشدہ کے ابتدائی دو خلفاء کے دور میں کیا تھے۔اب ہم اس کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک طرح کی خیرات ہے جو ہر سال اپنی آمدنی کی بچت سے غریبوں کے لیے کرتے ہیں۔حالاکہ صرف غریبوں کا ہی اس میں حق نہیں ہے بلکہ اور مدات بھی اس کے اندر شامل ہیں، جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔

اب میں اس سوال کا جواب یتا ہوں کہ مسلمانوں سے تو یہ سلوک ہو رہا ہے، پھر غیر مسلم رعایا سے کیا کیا جاتا ہے؟ اس سلسلے میں دو چیزیں نظر آتی ہیں۔اولاً مثلاً زراعت ہے، زراعت کے سلسلے میں ابتدائی دور میں حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں کسی علاقے کو فتح کیا جاتا تو ایک معاہدےکے ذریعے یہ صراحت کی جاتی کہ اس علاقے کے لوگ کتنی رقم حکومت کو سالانہ پیش کریں گے۔اور پھر اس کے لیے ایک خصوصی انتظام کیا جاتا اور اس علاقے میں حکومت کا ایک نمائندہ یا نائب ہوتا جو مقامی رعایا سے رقم وصول کرکے، حکومت کو سالانہ مجموعی رقم ادا کردیا کرتا۔اس کو خراج کا نام دیا جاتا تھا۔یہ خراج زراعتی اراضی کے لیے بھی ہوتا، دیگر چیزوں کے لیے بھی ہوتا۔اس طرح غیر مسلم رعایا سے جزیہ بھی لیا جاتا، جس قرآن حکیم (۹: ۲۹) نے حکم دیا ہے جو اولاً قرآنی احکام کے تحت صرف اہل کتاب یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کے متعلق خیال کیا گیا لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں اولاً اس میں مجوسیوں یعنی پارسیوں کو شامل کیا گیا۔حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بربر جو شمالی افریقہ میں رہنے والی ایک بت پرست قوم تھی ، ان کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔پھر جلد ہی جب سندھ فتح ہوا تو ہندو اور بدھ مت لوگوں کو جو وہاں پائے جاتے تھے، اسی زمرے میں شامل کرلیا گیا اور وہ بھی جزیہ دینے لگے۔ اسی طرح غیر مسلم رعایا سے اور بھی ٹیکس لیے جاتے تھے۔بعض صورتوں میں مسلمانوں کے ٹیکس سے کسی قدر گراں تر شرح سے، مثلاً اگر مسلمان تاجر کسی مقام پر سامان لاتے تو ان سے ڈھائی فیصد شرح کے حساب سے چنگی وصول کی جاتی تھی۔اگر وہ ذمی ہوتے تو ان سے پانچ فیصد کی شرح سے، اگر غیر ملکی اور غیر مسلم ہوتے تو ان سے دس فیصد، غرض شرح مختلف ہوتی تھی۔ذکر آیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مدینہ میں گرانی بڑھنے لگی تو انہوں نے غیر ملکی غیر مسلم تاجروں سے محصول درآمدیا امپورٹ ڈیوٹی بجائے دس فیصد کے پانچ فیصد کردی تاکہ سامان کے نرخ میں تخفیف ہو اور لوگوں کو گرانی کی جگہ ارزانی میسر ہو۔اس طرح چند اصول تھے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں فرق کی صورت میں ہمیں نظر آتے ہیں۔جیسا کہ دنیا کے بعض غیر مسلم علاقوں میں بھی پائے جاتے تھے۔ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو زکوٰۃ سونے اور چاندی کے متعلق ہے، اس کا کیا قاعدہ ہے؟ اس بارے میں صراحت ملتی ہے کہ یہ مسلمانوں پر واجب ہے لیکن غیر مسلموں پر نہیں۔غیر مسلموں سے ٹیکس اور خراج کے نام سے زراعت وغیرہ کی زکوٰۃ تو لی جاتی ہے

لیکن سونے، چاندی، درہم اور دینار کے اندوختے پر ان سے زکوٰۃ نہیں لی جاتی۔اس کی وجہ جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ غیر مسلموں کو اس حکومت کے اندر داخلی خود مختاری دے دی گئی تھی۔مسلمانوں کے علاوہ جتنی رعایا تھی مثلاً یہودی، نصرانی اور پارسی وغیرہ وغیرہ، ہر کمیونٹی کو اپنے قومی و مذہبی معاملات میں آزادی حاصل تھی۔ان انتظامات کے لیے بھی کچھ رقم کی ضرورت ہونی چاہئیے۔لہٰذا غیر مسلم رعایا پر جو سونے اورچاندی کی رقم پر زکوٰۃ ہونی چاہئیے تھی، اس کو ان اقلیتوں کی مذہبی انتظامیہ کے لیے مخصوص کردیا گیا جو ان سے اپنا ٹیکس وصول کرتی اور اس کے ذریعے اپنی مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتی۔مسلمانوں سے نقد رقم پر زکوٰۃ لینے میں یہ امر بھی مضمر ہے کہ وہ رقم کو اندوختہ کرکے بیکار نہ رکھیں بلکہ اس کو ہر وقت گردش میں رکھیں کہ وہ پھلے پھولے اور نفع آور بنتی رہے۔دوسرے الفاظ میں رقم کو بیکار معطل ڈالے رکھنے کی گویا ایک "جرمانے" کے ذریعے سے حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔

اولاً جیسا کہ ابھی کچھ دیر پہلے عرض کرچکا ہوں کہ اپنی تقریر کے ایک جزء کے متعلق کچھ بیان کروں گا اور وہ تقویم کا مسئلہ ہے جو دلچسپ ہے اور اس پر ہمارے مؤلفین آج کل کم غور کرتے ہیں۔عرب میں اسلام سے پہلے شمسی سال پایا جاتاتھا جیسا کہ آج کل پایا جاتا ہے۔جس طرح انگریزی سنہ کی وجہ سے سال کے موسم معین مہینوں میں آتے ہیں۔لیکن عربوں کانظام فرنگی اصول سے الگ تھا۔مہینوں کا آغاز رویت ہلال سے ہوتا تھا اور مہینوں کا اختتام نئی رویت ہلال سے ہوتا تھا۔یعنی خالص قمری مہینے پائے جاتے تھے لیکن چونکہ قمری سال کے بارہ مہینوں میں عموماً چھ مہینے انتیسے اور چھ مہینے تیسے ہوتے تھے۔اگر ہم شمار کریں تو ایک سال میں دنوں کی مجموعی تعداد تقریباً ۳۵۴ دن بنتی ہے۔موسموں کا جو فرق پیدا ہوتا ہے، کبھی گرمی، کبھی سردی وغیرہ یہ آفتاب کی گردش کے باعث ہے۔آفتاب کی گردش ۳۶۵ یا ۳۶۶ دنوں میں مکمل ہوتی ہے۔کہتے ہیں کہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے قدیم زمانے میں بابل والوں نے جب یہ معلوم کرلیا کہ قمری سال بہ نسبت شمسی سال کے (جس میں موسموں کا لحاظ ہوتا ہے) کوئی گیارہ، بارہ دن چھوٹا ہوتا ہے تو انہوں نے شمسی تقویم اختیار کرلی۔بابل والوں نے دیکھاکہ اگر قمری سال پر عمل کریں توو فصل کاٹنے کا زمانہ، حکومت کو ٹیکس دینے کا زمانہ اور بیجوں کو بونے کا زمانہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا اور لوگوں کو اس کی وجہ سے نقصان ہوتا ہے۔انہوں نے اس کا ایک حل معلوم کرلیا اور وہ یہ تھا کہ تقریباً ہر تین سال کے بعد ایک مرتبہ بجائے بارہ کے

تیرہ مہینوں کا سال کردیا جائے۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ قمری سال گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے تو اس طرح تین سال میں تینتیس دن کم ہوں گے۔ جو تقریباً ایک مہینے کے برابر تو ہیں لیکن بہت ٹھیک نہیں بلکہ محض کم و بیش۔ غرض بابل میں ہر تین سال کے بعد سال میں ایک مہینے کا اضافہ کردیا جاتا تھا اور کیلنڈر میں اس سال تیرہ مہینے ہوتے اور پھر اس کے بعد دو سال بارہ، بارہ ماہ ہوتے۔ پھر تیسرا سال تیرہ مہینوں کا ہوتا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد تجربے نے ثابت کردیا کہ یہ حساب ٹھیک نہیں۔ کیونکہ قمری سال اگر شمسی سال سے تقریباً بارہ دن چھوٹا ہے تو تین سال میں ۳۲ دن بڑھانے کی ضرورت ہوگی، اور تیرہویں مہینے سے صرف انتیس یا تیس دن حاصل ہوسکیں گے۔ حقیقی فرق بارہ دن کا نہیں بلکہ اس میں گھنٹے، منٹ سیکنڈ اور سیکنڈ کا جزء بھی ہوتے ہیں جو ہر سال جمع ہوکر رفتہ رفتہ مزید فرق پیدا کردیتے ہیں۔ بہرحال اپنے علم کی ترقی سے انہوں نے تحقیقات کے ذریعے اس نظام کو اور زیادہ ترقی دی اور کہا کہ اتنے سال تک تو تین برس کے بعد ایک مہینے کا اضافہ ہوگا۔ جس کے بعد ایک مرتبہ دو ہی سال کے بعد تیرھواں مہینہ تقویم میں بڑھایا جائے گا وغیرہ۔ اس طرح وہ اس بات میں کامیاب ہوئے کہ زراعتی اعراض کے لیے قمری مہینوں کے ذریعے سے بھی شمسی سال کی طرح کام لیا جا سکے۔ شہر مکہ میں بھی یہ نظام پایا جاتا تھا۔ اس کو زمانہ جاہلیت میں "نسی" کا نام دیا گیا۔ میں یہاں اس کی تفصیلات بیان کرنے سے گریز کروں گا۔ میں اس پر ایک مستقل اور مفصل مقالہ شائع کرچکا ہوں۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ "نسی" کا جس میں سال میں کبھی کبھی تیرھواں مہینہ بڑھایا جاتا تھا مکہ میں رواج رہا، مکہ کے حج کے باعث پورے جزیرہ نمائے عرب میں اس پر عمل تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی، آخری تین مہینوں کے سوا، اسی نظام کے تحت بسر ہوئی۔ آخری تین مہینوں کے الفاظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ رسول اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں "نسی" کی منسوخی کا قرآنی حکم کے تحت اعلان فرمایا: " إِنَّمَا ٱلنَّسِيٓءُ زِيَادَةٌ فِي ٱلْكُفْرِ ۖ يُضَلُّ بِهِ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ يُحِلُّونَهُۥ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُۥ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوا۟ عِدَّةَ مَا حَرَّمَ ٱللَّهُ فَيُحِلُّوا۟ مَا حَرَّمَ ٱللَّهُ " (۹:۳۷) غرض اس کی منسوخی رسول اللہ ﷺ کے وصال کے صرف تین مہینے پہلے اور ذی الحجہ کے مہینے میں عمل میں آئی۔ اس "اصلاح" یا مخالفینِ اسلام کے الفاظ میں اس "نافہمی کی ترمیم" کی وجہ سے کیا نتائج نکلے، اسے دیکھنا پڑے گا۔ نافہمی کا لفظ وہ اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ دوبارہ خالص قمری نظام رائج ہوجانے کی وجہ سے حکومت کو ٹیکسیشن میں دشواریاں پیدا ہوگئیں۔

مثلاً انہوں نے طے کیاہو کہ رمضان کے مہینے میں ہر سال لوگ مال گزاری ادا کریں گے۔پہلے ایک دو سال تو رمضان کے مہینے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی ہو گی، لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ فرق بڑھتا گیا ہو گا اور پھر یہ ہوا ہو گا کہ رمضان آجاتا تھا اور فصلیں کٹتی نہیں تھیں بلکہ کھیتیاں کھڑی رہتی تھیں وغیرہ۔اس تصور کی بنا پر یہ فرض کرلیا گیا کہ یہ اصلاح نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے تخریب تھی، لیکن عہدِ نبویؐ کا رواج ہمیں اس کا جواب دیتا ہے کہ یہ ایسا نہیں تھا۔اگرچہ نسی کی منسوخی کا اعلان ذی الحجہ ۱۰ ھ میں کیا گیا لیکن اس کی پیش بندی میں کچھ عرصہ پہلے سے ہی ایک اور انتظام قائم کردیا گیا تھا، جس کے اشارات ہمیں پوری وضاحت کے ساتھ مختلف مکتوباتِ نبویؐ میں ملتے ہیں۔مختلف قبیلوں کے سرداروں کو پروانے دیے جاتے ہیں، ان سے معاہدے ہوتے ہیں یا ان کو کوئی جاگیروغیرہ دی جاتی ہے تو اس میں صراحت ہے کہ یہ لوگ اپنی زراعتی زکوۃ معین مہینے میں یعنی رمضان شوال وغیرہ میں نہیں دیں گے۔بلکہ فصل کٹنے پر ادا کریں گے۔سب سے بڑی دشواری قمری سال میں یہی ہے کہ وہ زراعتی اغراض کے لیے کارآمد نہیں ہے۔اس کا حل رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زراعتی اغراض کے لیے لوگ اپنا ٹیکس یا مال گزاری قمری مہینے کے لحاظ سے ادا نہیں کریں گے بلکہ فصل کے کٹنے پر۔لہٰذا ساری دشواریوں کا اس طرح خاتمہ ہوجاتا ہے۔باقی جو دوسرے ٹیکس ادا کرنے ہوتے ہیں، مثلاً تجارت پر معدنیات پر اس میں اسی ترمیم اور اس نظام کی تبدیلی یعنی شمسی سال کی جگہ قمری سال کو نافذ کرنے کی وجہ سے، حکومت کو ایک غیر معمولی فائدہ ہوا۔ایک مرتبہ جرمنی میں ایک لیکچر دیتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اگر اس مصلحت کو آج روسی اور امریکی وزرائے مالیات معلوم کریں تو دونوں ہی قمری سنہ کو اختیار کرلیں گے اور شمسی سنہ کو رد کردیں گے۔اس کیوجہ میں نے یہ بتائی کہ چونکہ شمسی سال سے قمری سال گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے لہٰذا ہر تیس سال میں شمسی لحاظ سے توحکومت تیس مرتبہ ٹیکس وصول کرے گی لیکن قمری سال کے حساب سے اکتیس مرتبہ ٹیکس لے گی۔حکومت کو ہر سال تیس سال میں ایک زائدسال کے ٹیکس وصول ہوں گے۔کون سا وزیر مالیات ہو گا جو اس زائد آمدنی کو قبول نہ کرے گا؟ تقویم کی اس تبدیلی کی وجہ سے، اس میں شک نہیں کہ قانون میں ایک طرح کی لا مرکزیت (Decentralization) پیدا ہوجاتی ہے۔بعض چیزوں پر ایک زمانے میں ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور بعض چیزوں پر کسی دوسرے زمانے میں۔یہ کوئی مصیبت کی چیز نہیں تھی بلکہ ایک اور نقطہ نظر سے جانچیں تو حکومت کے

لیے بھلائی کی چیز تھی۔معلوم نہیں آپ لوگوں کو واقفیت ہے کہ انہیں کہ آج کل حکومت کا خزانہ ٹیکس کے ادا ہونے کے زمانے سے عین پہلے خالی ہوجاتا ہے اور اس کو اپنی فوری ضرورتوں، ملازمین کی تنخواہوں وغیرہ کے لیے رقم نہیں ملتی، تو وہ Debenture کے ذریعے سے مختصر مدت کے لیے سود پر قرض لیتی ہے۔پھر جب ٹیکس کی وصولی کے باعث خزانہ بھر جاتا ہے تو وہ قرضے ادا کردیتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ شمسی سال کے تحت سارے بڑے ٹیکس ایک معین مہینے میں آتے ہیں مثلاً زکوٰۃ کا زراعت کا ٹیکس ہے، فرض کیجئے وہ اگست کے مہینے میں ہمیشہ آئے گا۔دیگر ٹیکسوں میں کچھ تو مثلاً چنگی، ریل کے ٹکٹ روزانہ کے ہیں اور کچھ دیگر قسم کے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کا خزانہ ایک خاص زمانے میں خالی ہوجاتا ہے تو حکومت کے پاس روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مطلوبہ رقم نہیں ہوتی۔اسلامی حکومت میں اس نظام کے تحت یعنی اس اصلاح کے تحت حکومت کے ٹیکس مختلف موقعوں پر وصول ہوتے ہیں۔جو زراعتی ٹیکس ہے اس کا مہینہ الگ ہوتا ہے، دیگر ٹیکسوں کا زمانہ علیحدہ ہوتا ہے۔اس طرح حکومت کا خزانہ ہر زمانے میں بھرا رہتا ہے اور رہ سکتا ہے۔یہ بات شمسی سال میں نہیں پائی جاتی۔یہ ایک خاص پہلو تھاجس کی طرف مجھے اشارہ کرنا تھااور شاید آخری جملے کے طور پر عرض کروں کہ سارے اسلامی ممالک میں موجودہ شمسی تقویم یعنی فرنگی نظام چل رہا ہے۔اس نظام میں باوجود علم کی ترقی اور انتہائی دقیق آلات کی ایجاد کے اب بھی رفتہ رفتہ فرق پیدا ہورہا ہے۔کہا جاتا ہے کہ ایک ہزار سال کے بعد پورے ایک دن کا فرق پیدا ہوجائے گا۔عمر خیام نے بھی اپنے زمانے میں ایک نظام پیش کیا تھا۔میں نے اس کا جو مقالہ پڑھا تھا، اگرچہ میں اس کی تفاصیل سمجھنے سے قاصر رہا، البتہ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ عمر خیام کے نظام سے ایک دن کا فرق ایک لاکھ سال بعد پیدا ہوگا۔اس کا نظام زیادہ پیچیدہ ہے لیکن اتنا صحیح ہے کہ پورے ایک لاکھ سال میں بھی مشکل سے ایک دن کا فرق پیدا ہوتا ہے۔یہ تھیں چند گزارشات جو مجھے آپ کے سامنے پیش کرنا تھیں۔السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاۃ

سوال وجواب

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

متعدد سوالات آپ کی طرف سے آئے ہیں، میں جوابات دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال ۱: "الخمس مردود علیکم" کی رو سے ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی گزر اوقات مالِ غنیمت پر تھی؟

جواب: "خمس مردود علیکم" یہ مالِ غنیمت کے اس جزء (۴/۵) کا ذکر ہے جو حکومت کو آتا ہے۔ مالِ غنیمت کا (۴/۵) حصہ سپاہیوں میں تقسیم ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ اگر فوج کی لڑائی میں شریک رہے ہوں تو آپؐ کا حصہ بھی فوج کے دیگر سپاہیوں کی طرح اس (۴/۵) سے ملے گا اور وہ آپؐ کی ذاتی ملکیت ہو گی، اور اس پر گزر اوقات میں کوئی امر مانع نہیں۔ اور خمس جو حکومت کو ملتا ہے اس کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ کو بحیثیت صدر مملکت کچھ اختیارات دیے گئے ہیں اور عام زکوٰۃ کے بر خلاف مالِ غنیمت سے حاصل ہونے والی آمدنی کو رسول اللہ ﷺ اپنے اور اپنے خاندان کے لیے استعمال فرما سکتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن مالِ غنیمت کوئی ایسی چیز نہیں جو ہر وقت آئے یا بہت کافی مقدار میں ہو اس لیے روزمرہ کی غذا وغیرہ کے لیے اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

سوال ۲: علماء کو ہدیہ دینا جائز ہے اگر امداد کے طور پر دینا چاہیں؟ براہ کرم وضاحت فرمائیں۔

جواب: میرے خیال میں اس سوال کے جواب کی کوئی ضرورت نہیں۔ لوگوں کی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں، مجھے اگر ہدیہ دیا جائے تو میں رد کر دیتا ہوں، چاہے کتنی ہی محبت سے کوئی پیش کرے۔ کوئی عالم اسے قبول کرنا چاہے تو میں اسے روکتا نہیں۔ عام اصول، بطور سفارش کے کہیئے یا بطور تاکید کے، ایک حدیث شریف میں مذکور ہے کہ استاد کو اپنے شاگردوں سے کوئی چیز نہیں لینی چاہیے۔۔ اور اس سلسلے میں ایک سخت لفظ استعمال ہوتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ عبادہ بن الصامتؓ، رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے یا

رسول اللہ ﷺ! مجھے ایک شاگرد نے، جسے میں نے قرآن کی تعلیم دی تھی، ایک کمان ہدیہ کی ہے کہ میں اس سے جہاد فی سبیل اللہ کروں۔ رسول اللہ ﷺ نے جواباً فرمایا یہ کمان جہنم کی آگ ہے۔ تو وہ دوڑے ہوئے گئے اور کمان اپنے شاگرد کو واپس کر دی۔ علماء کو ہدیہ دینا نیت پر مبنی ہے۔ اگر آپ کا منشاء زکوٰۃ کی رقم میں سے بطورِ خیرات اپنے استاد کو دینا ہو اور اگر وہ استاد خاندان بنی ہاشم سے تعلق رکھتا ہو تو ہماری فقہ کے مطابق یہ اس کے لیے حرام ہے۔ لیکن اگر وہ غریب ہے تو وہ لے سکتا ہے۔ اس کے متعلق کوئی خاص چیز بیان کرنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

سوال ۳: آپ کے بیان کردہ اصول کے مطابق آج کل مسافروں کو مفت ہوٹل اور کھانا مہیا کرنا شروع کر دیا جائے تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہو گی کہ لوگ مستقل مسافر نہ بن جائیں؟

جواب: ایسا نہ سمجھئے۔ پیرس میں ہر محلے میں بیروزگار غریبوں کو روزانہ مفت کھانا کھلایا جاتا ہے لیکن کوئی شریف آدمی کبھی وہاں نہیں جاتا۔ یوں بھی ایک شہر میں تین دن رہیں گے۔ اس کے بعد انہیں جبراً وہاں سے رخصت کر دیا جائے گا۔

سوال ۴: اگر کسی کو کثیر رقم قرض دی گئی ہو تو کیا اس پر زکوٰۃ ہو گی، جب کہ وہ قرض تین سال کے لیے دیا گیا ہو؟

جواب: زکوٰۃ کی ضرورتوں کے لیے، قرض دی گئی رقم کو جائیداد میں سے حذف کر دیا جاتا ہے۔ فرض کیجئے میرے پاس ایک لاکھ روپے تھے اور میں نے مثلاً نوے ہزار روپے قرض دے دیے ہیں تو خیال کیا جائے گا کہ زکوٰۃ کی ضرورتوں کے لیے میرے پاس صرف دس ہزار روپے ہیں۔ اس لیے اس میں کوئی دشواری نہیں۔

سوال ۵: یتیم کے مال کا ولی "زکوٰۃ" دے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: اس بارے میں ہمارے فقہاء کی رائے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دینی ادائیگیاں کرنی چاہئیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ ہر شخص صرف اپنے اپنے امام کے فتاویٰ کے مطابق عمل کرے گا۔

سوال۶: "فی سبیل اللہ" کے مال اور رقم سے کیا ملک کے دفاع کی خاطر ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم خریدے جاسکتے ہیں، حالانکہ ان سے بہت سے بے گناہ افراد مارے جاتے ہیں اور ان کے اثرات آنے والی نسلوں کو بھی متاثر کرتے رہتے ہیں۔ بحوالہ ہیروشیما، ناگاساکی وغیرہ؟

جواب: جہاں تک دفاع کا تعلق ہے اس میں کوئی امتیاز نہیں کہ کس غرض کے لیے ہم رقم صرف کرتے ہیں۔ یہ امر تجربے سے معلوم ہوچکا ہے کہ ایٹم بم کا استعمال اب تک صرف ایک دفعہ ہوا ہے اور اس کے بعد جن سلطنتوں کے ہاتھ میں ایٹم بم ہے، اگر وہ جنگ میں شریک بھی ہوئیں تو انہوں نے آج تک اس کا استعمال نہیں کیا۔ وہ ایک Dissuasive چیز بن جاتی ہے اور اگر کسی سلطنت کے پاس ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم ہو تو اوروں کو اس پر آسانی کے ساتھ حملہ کرنے کی جسارت نہیں ہوتی۔ جیسا ہم اپنے ہمسائے ملک افغانستان میں دیکھ رہے ہیں۔ اگر پاکستان کے پاس مذکورہ بم آجائیں اور انشاءاللہ تعالیٰ آجائیں گے تو ہمارے بہت سے ہمسائیوں کی ہوس ملک گیری بڑی حد تک کم ہوجائے گی۔

سوال۷: حکومت زکوٰۃ اور عشر وصول کرنے کے بعد پراپرٹی ٹیکس وصول کرسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: آج سے نہیں بلکہ ہزار سال سے زیادہ عرصے سے اسلامی حکومتیں یہ تجربہ کرچکی ہیں کہ ان کی آمدنیاں جو کہ زکوٰۃ و عشر سے حاصل ہوتی ہیں ان کی ضرورتوں کے لیے ناکافی ہیں۔ تو اپنے زمانے کے فقہاء کے فتوے اور اجازت سے اور اتفاقِ رائے سے رعایا اور حکومت دونوں کی ضرورت کے پیشِ نظر نئے ٹیکس لگائے گئے اور انکو "نوائب" کا نام دیا گیا۔ جس کے معنی فوری ضرورتوں کے لیے عارضی ٹیکس کے ہیں۔ یہ عارضی ٹیکس عملاً مستقل بن جاتے ہیں لیکن منشاء یہ ہوتا ہے کہ یہ مستقل ٹیکس مثلاً زکوٰۃ کی طرح کے نہیں ہوں گے بلکہ ان کی حیثیت عارضی ہوگی۔ جب تک وہ ضرورت باقی ہے اس پر عمل کیا جاتا رہے گا۔ یعنی جن حالات میں ہماری ضرورتوں کے لیے زکوٰۃ اور عشر ناکافی ثابت ہوں (اور میں سمجھتا ہوں کہ ناکافی ثابت ہوں گے) تو ان حالات میں "نوائب" کے نام سے مزید ٹیکس لگائے جاسکتے ہیں۔ اس کے بغیر ملک کی معمولی اور بنیادی ضرورتوں کو ہم پورا نہیں کرسکتے، چاہے وہ دفاع کی ضرورت ہو یا ضروریات، مگر اس کا فیصلہ میں نہیں کروں گا۔ حکومت کی وزارتِ مالیہ اور پارلیمنٹ کرسکے گی کیونکہ نوائب واجبی نہیں مباح چیز ہیں۔

سوال۸: کیا ہم مسلمان ٹیلیویژن دیکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب: یہ مسئلہ شاید اختلافی بن جائے گا، اس بنا پر کہ فوٹو گراف کو ہمارے بعض علماء جیسے مصر کے محمد عبدہ کہتے ہیں کہ جائز ہے، بعض مجھ جیسے جاہل کہتے ہیں کہ ناجائز ہے، ٹیلی وژن میں بھی فوٹو آتا ہے تو میری رائے میں وہ ناجائز ہو گا۔ اگر محمد عبدہ کی آپ تقلید کرنا چاہیں تو وہ جائز ہو جائے گا۔ لیکن میں بھی اور وہ بھی اس بات پر متفق ہوں گے کہ ٹی وی کا استعمال فحش اغراض کے لیے اور ایسی چیزوں کے لیے جن کا مقصد تعمیری نہیں تخریبی ہے، نہیں ہونا چاہئے۔

سوال۹: خلیفہ پر مقدمہ چلانے (Impeachment) کا طریقہ کار اسلام میں کیا ہے؟

جواب: جہاں تک مجھے معلوم ہے Impeachment کے معنی ہیں مقدمہ چلا کر سزا دینا۔ اس کی کوئی مثال تاریخِ اسلام میں نہیں ہے۔ خلفاء کو معزول کیا گیا، خلفاء کو قتل کیا گیا۔ لیکن یہ فوجی افسروں کی اپنی صوابدید پر ہوا، عدالت کے حکم سے نہیں کیا۔ اس کا کوئی طریقہ ہے یا نہیں، میرے لیے یہ کہنا دشوار ہے، لیکن ہمارے فقہاء قدیم سے یہ کہتے آئے ہیں کہ جو لوگ کسی کو خلیفہ یا حکمران بنا سکتے ہیں وہی اس کو معزول بھی کر سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حاکم کی حیثیت وکیل یعنی نائب کی ہے، یعنی میں ایک شخص کو اپنے ذاتی انتظامات کے لیے اپنا نائب مقرر کرتا ہوں تو مؤکل کو حق ہوتا ہے کہ وکیل کو جب چاہے اس کی خدمات سے الگ کر دے، اس لیے اس اساس پر ہمارے فقہاء کہتے چلے آئے ہیں کہ اگر حکمران نااہل ثابت ہوں تو انہیں معزول بھی کیا جا سکتا ہے۔ غالباً یہی ایک صورت ہے جس کا فقہاء نے ذکر کیا ہے۔ حکمران پر مقدمہ چلانے Impeachment کا جو مغربی تصور ہے، وہ میری دانست اور میرے علم میں کبھی پیش نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے یا نہیں، اس کے متعلق میں صرف اپنی ذات کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ وہ ممنوع نہیں ہے، اس کا فیصلہ ہماری پارلیمنٹ کر سکتی ہے۔

سوال۱۰: سنگ تراشی، مصوری، فلم وغیرہ تفریح کے دائرے میں آتے ہیں یا نہیں؟ یا انہیں معصیت گردانا گیا ہے؟

جواب: میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ تصویر کے متعلق میرا اپنا تصور حرمت کا ہے اور بعض دوسرے بڑے علماء جیسے محمد عبدہ اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک فلم اور فوٹو گرافی کا تعلق ہے اس میں کچھ حد تک اختلاف رائے ہے۔ باقی سنگ تراشی (بت تراشی) اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے، سبھی اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔

سوال ١١: اگر ایک آدمی کو اس کے حق سے محروم کیا جارہا ہو اور بجز اس کے کہ وہ رشوت دے، اس کو اپنا جائز حق ملنے کی امید نہیں، تو کیا اس صورت میں رشوت جائز ہو گی؟

جواب: یہ بڑا مشکل سوال ہے کیونکہ حدیثِ مبارکہ کے الفاظ میں الراشی والمرتشی کلاھما فی النار یعنی رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنم میں جائیں گے۔ لہذا اسے چاہیئے کہ رشوت نہ دے تھوڑی مصیبت بھگت لے۔ اگر ہم رشوت دینے سے اجتناب کریں تو ملک سے اگر رشوت ستانی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، تو کم از کم اس میں کمی تو واقع ہو گی۔ لیکن ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ آدمی مجبور ہو جائے تو اپنی جان بچانے کے لیے اپنا مال خرچ کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مثال میرے ذہن میں ہے۔ لکھا ہے کہ جب ہجرت سے پہلے بہت سے مکہ کے مسلمان حبشہ گئے تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ انہیں کسی وجہ سے حبشہ کی پولیس سے کچھ دشواری پیش آئی اور انہوں نے اس کو نصف دینار یا پانچ درہم بطور بخشش کے دے دیے اور اس طرح ان کی گلو خلاصی ہوئی۔

سوال ١٢: رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت کی ذرا وضاحت کیجیے۔ کیا آل رسول یعنی سید زادوں کو اہل بیت قرار دے سکتے ہیں؟

جواب: میری رائے میں قرار دینا پڑے گا۔ اس میں یہ ذکر نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں آپ کی جو اولاد ہے بلکہ پورے بنو ہاشم اور بنو المطلب بھی۔ اس کے معنی ہیں وہ لوگ جو اس وقت بڑے تھے اور وہ لوگ جو بچے تھے، سب اس میں داخل تھے۔ ان کے بعد آنے والے بچے بھی اس میں داخل ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ہمارے علماء کا اتفاق ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اگر کسی زمانے میں اہل بیت (سید زادوں) میں سے کسی کے لیے کوئی ذریعہ معاش بالکل موجود نہ ہو اور حکومت بھی ان کی ضرویات کو پورا کرنے سے عمداً یا سہواً یا عدم امکان کی وجہ سے، غافل ہو تو ان کو خیرات دے سکتے ہیں۔

سوال ۱۳: اسلامی نقطہ نظر سے انسان اپنے جسم کا مالک نہیں ہے بلکہ اس کی مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ کیا اسلامی نقطہ نظر سے آنکھوں، خون اور دیگر اعضائے جسمانی کا عطیہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اس طرح کسی دوسرے شخص کی آنکھ یا دل وغیرہ لگانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اس بارے میں نہ آپ کو قرآن میں کوئی ذکر ملے گا، نہ حدیث میں اور نہ ہی ہمارے پرانے آئمہ اور فقہا کی کتابوں میں۔ یہ چیز علم طب کی جدید ترین ترقی ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہوئی ہے۔ اس بارے میں ابھی تک کوئی اجماع نہیں ہو سکا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اور فقہاء کی کیا رائے ہے۔ میں اپنی ذاتی رائے عرض کر سکتا ہوں، ممکن ہے اس سے اوروں کو اتفاق ہو، ممکن ہے وہ اسے رد کر دیں۔ ایک زندہ کی جان بچانے کے لیے ایک مردہ کی ذات سے استفادہ کیا جائے تو اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ اس طرح ایک انسان کی فالتو چیز سے دوسرے انسانوں کا فائدہ ہوتا ہو، تو اس کی اجازت سے ہم استعمال کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں فرض کیجئے ایک آدمی مر جاتا ہے اور فوراً ہی اس کی آمکھوں کو لے کر آج کل طبی طریقے سے محفوظ کر لیتے ہیں اور ان کو کسی اندھے کے لیے استعمال کر کے اسے بینائی بخشتے ہیں۔ میرے خیال میں ایک زندہ کی جان بچانے کے لیے ایک مردہ کے جسم سے استفادہ کر لیا جائے تو اس میں کوئی امر مانع نہ ہو گا۔ اس طرح اگر میں اپنا خون کسی کو دوں تو ایک طرح کی خیرات ہے اور میں خوشی سے دیتا ہوں تو کوئی امر مانع نہیں۔ اگر مجھ سے جبراً لیا جائے تو ممکن ہے حقوقِ انسانی کی خلاف ورزی کے تحت آجائے۔ حدیث شریف میں مثلہ کرنے (Mutilation) کی بے شک ممانعت آئی ہے لیکن اس کا مقصد مرے ہوئے شخص کی توہین ہوتی تھی۔ اعضاء کی علاج کے لیے منتقلی میں یہ بات بالکل نہیں پائی جاتی۔

سوال ۱۴: مسلمانوں سے چنگی کی شرح اور غیر مسلموں سے چنگی کی شرح میں تفاوت بظاہر ظلم لگتا ہے۔ براہ کرم اس نکتے کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: یہ سوال خود مجھے بھی کھٹکا تھا۔ عرصہ تک میں اس پر غور کرتا رہا اور اس کا جواب جو میرے ذہن میں آیا، وہی میں آپ سے عرض کرتا ہوں۔ یہی جواب میں نے ایک اطالوی پروفیسر "لیوی دیل لاویدا" کو دیا تھا جو یہودی النسل تھے۔ وہ اعتراض پر تلے ہوئے

تھے اور جب میں نے تشریح کی تو وہ ایک دم چپ ہو گئے اور کہا کہ اس منطق کے سامنے کسی رابی Rabbi کی زبان بھی نہ کھل سکے گی۔ میرا جواب یہ تھا کہ مسلمانوں پر بعض بندشیں ہیں جو غیر مسلموں پر نہیں۔ انہیں سب سے اہم سہولت سود کی ہے جب کہ ایک مسلمان نہ سود لے سکتا ہے، نہ دے سکتا ہے۔ اس کے بر خلاف اسلامی قانون غیر مسلموں کو داخلی خود مختاری عطا کرتا ہے جس میں ان کا حق ہے کہ وہ سود لیں یا دیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک سود لینے والا غیر مسلم تاجر بہت جلد متمول ہو جاتا ہے بہ نسبت ایک مسلمان تاجر کے۔ اس طرح اس کی سالانہ آمدنی بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ چونکہ اس کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے لہٰذا ٹیکس بھی زائد شرح سے عائد ہوتا ہے۔ اسے ظلم نہیں کہا جا سکتا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اس ٹیکس کی شرح کی زیادتی کے باوجود غیر مسلم زیادہ فائدے میں رہتا ہے، اس لحاظ سے بھی کہ اسلامی حکومت مسلمان پر زیادہ مالی ذمہ داریاں اور پابندیاں عاید کرتی ہے بہ نسبت غیر مسلوں کے۔ ملکیوں اور غیر ملکیوں میں فرق بہت سے ملکوں میں رہا ہے اور اب بھی ہے آپ نے اخباروں میں بارہا "نہایت منظور نظر قوم کا سا برتاؤ" Most Favoured Nation Clause کا بھی ذکر پڑھا ہو گا اور امریکہ وغیرہ کی Protectionism (یعنی اپنے اقتصادی مفاد کے تحفظ کے لیے اجنبی مالک تجارت کی درآمد پر بندشوں) کا بھی ملکیوں میں مسلم اور غیر مسلم کے فرق کی وجہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ وہ فرق حقیقی نہیں بلکہ ٹیکنیکل ہے۔

سوال ۱۵: آپ نے اپنی گزشتہ تقاریر میں جس فرقہ بندی کی حمایت کی ہے وہ مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔ یہی فرقہ پرستی مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دور کر رہی ہے۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا (۳:۱۰۳) (اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ بازی نہ کرو) ایک اور جگہ پر آیا ہے کہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم (۴۸:۲۹) (کافروں کے لیے سخت اور آپس میں نرم) یہ حکم ایمان لانے کے بعد ہر مسلمان پر نافذ ہوتا ہے تو ان آیات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنا نقطہ نظر واضح کریں؟

جواب: میں سمجھتا ہوں ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ میں نے یہ کہا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کام مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے انجام دیا ہے اور ایک گروہ کے نزدیک مثلاً حنفی یا شافع، ایک عمل کی روایت کے مطابق ایک بات پر

عمل ہوتا ہے اور دوسرے گروہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت پر (ایک دوسری روایت کے مطابق) عمل ہوتا ہے، تو ہمیں رواداری سے کام لینا چاہیے اور اس کو فرقہ واریت قرار نہ دیں۔ کیونکہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مبنی ہیں۔۔ خیال فرمایئے کہ اگر آج ایک حنفی کسی شافعی کے پیچھے نماز سے یا شافعی حنفی کے پیچھے نماز پڑھنے سے اس بناء پر انکار کرے کہ اس کے امام کے بیان کردہ طریقے کے خلاف ورزی ہو گی، تو اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے فرقے کے امام کے طریقے کے مطابق نہیں بلکہ کسی دوسرے فرقے کے امام کے طریقے کے مطابق کسی دن عمل فرما رہے ہوں ، تو میں خود رسول اللہ صلی اللہ عیلیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتا ہوں، کون مسلمان اس بات کا تصور بھی کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرے۔ اس نقطہ نظر سے غور فرمائیں تو آپ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ باہم رواداری زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ ہم میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت اگر ایک سے زیادہ طریقوں پر مشتمل رہی ہے تو بھی آپؐ کا طرزِ عمل ہے۔ ہمیں اس کا ادب و احترام کرنا چاہئیے۔

سوال نمبر ۱۶: کیا زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا سربراہ مملکت اس کی شرح میں تبدیلی کا مجاز ہے؟

جواب: میں ٹیکس کا لفظ اپنی تقریر میں خود استعمال کر چکا ہوں اور کہہ چکا ہوں کہ اگر ٹیکس کا مطلب یہ ہے کہ ایک معینہ زمانے میں، ایک معینہ شرح سے ایک معینہ چیز، پر ہم رقم وصول کریں اور دینے سے انکار کرنے والے سے بالجبر وصول کریں، تو اس لفظ کا پورا پورا اطلاق زکوٰۃ پر بھی ہوتا ہے اور یہ بھی میں نے بیان کیا کہ زکوۃ کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ شروع میں زکوٰۃ ایک اختیاری چیز تھی یعنی خیرات کی طرح تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ قرآن مجید نے اس کو ایک فریضہ قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا زمانہ مقرر کیا، اس کی شرح مقرر کی اور اس کی ادائیگی پر مجبور کر دیا اور حضرت ابو بکرؓ کی طرزِ بود و باش بتاتی ہے کہ زکوٰۃ دینے سے انکار کیا جائے تو تلوار کے ذریعے اس سے وصول کیا جائے گا۔ یہی ٹیکس کے عناصر ہیں۔ ان حالات میں اگر زکوٰۃ کو ٹیکس کا نام دیا جائے تو وہ غلط نہ ہو گا۔ اگرچہ ٹیکس ایک برا لفظ ہے۔ اس کے معنی تکلیف دینے کے ہیں۔ اس لیے ہم نے ایک بہتر لفظ "زکوٰۃ" اختیار کیا ہے جس کے معنی ہیں "پاک کرنا"۔ میرے مال میں خدا کے حکم کے مطابق لوگوں کا جو حصہ ہے اس کا ادا کرنا مجھ پر فرض ہے۔ صرف لفظ کا فرق ہے، جب کہ معنی کی حد تک دونوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس کی شرح میں تبدیلی کی جا سکتی یا نہیں؟ اس سلسلے میں ہمارے فقہاء کی رائے یہ

ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کی شرح کو نہ بدلا جائے اور عصری ضرورتوں کے لیے "نوائب" کے نام سے نئے ٹیکس لگائے جائیں، تو اس طرح مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ ہمارا قانون جو خدا اور رسول اللہ ﷺ کے احکام کا نام ہے، اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا کسی کو اختیار نہیں اور نہ ہی آج تک ایسی صورت پیش آئی ہے اور غالباً آئے گی بھی نہیں کہ ہماری حکومت یہ قرار دے کہ زکوٰۃ ایک گراں ٹیکس ہے اس کی ضرورت اب باقی نہیں رہی، اسے اب کم کیا جائے۔ اس کے برخلاف زکوٰۃ کی آمدنی سے زیادہ ہماری حاجات ہوتی ہیں، لہٰذا "نوائب" کے نام سے مزید ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ ہاں ایک چیز کہی جاتی ہے کہ قیامت کے قریب مسلمانوں میں دولت کی اس قدر فراوانی ہو جائے گی کہ لوگ مستحقینِ زکوٰۃ کی تلاش کریں لیکن انہیں کوئی بھی ملے گا نہیں۔ یہ ایک پیشن گوئی ہے جو ممکن ہے پوری ہو جائے۔ اس صورت میں زکوٰۃ دینے کی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ کوئی لینے والا نہیں ہو گا۔

سوال ۱۷: کیا زکوٰۃ کی رقم سے مسجد بن سکتی ہے؟

جواب: میری رائے میں "فی سبیل اللہ" کی رقم سے مسجد بن سکتی ہے اور زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کی مد بھی ہے۔ ایک چیز کے متعلق ہمارے بعض فقہاء کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کو اس پر خرچ نہیں کیا جا سکتا، وہ متوفی کی تجہیز و تکفین کا مسئلہ ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ میں کسی شخص کو مالک بنایا جاتا ہے اور چونکہ متوفی مالک نہیں بنتا، لہٰذا متوفی کو زکوٰۃ کے ذریعے، کفن دینا ممکن نہیں۔ اس کا حل میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعے سے کفن خود مرنے والے کو نہ دیجئے بلکہ متوفی کے کسی قریبی رشتہ دار کو مدد کے طور پر زکوٰۃ دیجئے کہ وہ اس رقم سے اپنے متوفی عزیز کے کفن دفن کا انتظام کر سکے۔ یا کفن کا کپڑا ہی خرید کر غسال کو دے دیجئے۔ اس طرح وہ دشواری باقی نہیں رہتی جو عارضی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی شخص کی وفات ہو جائے اور اس کے قریبی رشتہ دار بالکل نہ ہوں تو ناگزیر ہو گا کہ دیگر مسلمان اس کی تکفین و تدفین کریں چاہے وہ زکوٰۃ کی رقم سے ہی کیوں نہ ہو۔

سوال ۱۸: کیا یہ امر درست ہو گا کہ کوئی شخص کسی فقہی مسلک کی اتباع "ایسر الامور" کے تحت کرے اور مسائل میں اپنی ضرورت اور سہولت کو بھی مدِ نظر رکھے؟

جواب: میں شخصاً اس کا قائل نہیں ہوں۔ زندگی کا اصول یہ ہے کہ ہر انسان کو کسی قانون پر عمل کرنا چاہئیے۔ آسان ترین راستہ تو یہ ہوگا کہ کسی قانون پر عمل ہی نہ کیا جائے، مگر سب لوگ تسلیم کریں گے کہ یہ غلط خیال ہے۔ قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے احکام کے تحت ہر کام کرنا چاہئیے۔ چاہے بار گزر رہا ہو کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے۔ اس کی خلاف ورزی محض آسانی کی خاطر نہیں کرنی چاہئیے۔ یہ اسلامی تعلیمات کی روح کے منافی ہوگا۔ معقول چیز پر عمل کرنا چاہئیے، صرف آسان چیز ہمیشہ معقول نہیں ہو سکتی۔

سوال ۱۹: کیا استعمال میں آنے والے سونے چاندی کے زیوروں پر زکوٰۃ ہوگی؟

جواب: ہمارے فقہاء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ عورت کے استعمال کے زیورات پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ نہیں، اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ سوائے اس کے میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ ہر شخص اپنے امام کے احکام پر عمل کرے۔

سوال ۲۰: کتنی نقد رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یعنی کم سے کم مقدار پر؟

جواب: یہ مسئلہ اس طرح پیچیدہ ہو گیا ہے کہ ہمارے فقہاء کے نزدیک عہدِ نبوی میں دو سو درہم پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا اطلاق شروع ہوتا تھا۔ دو سو درہم سے کم پر نہیں اور وہ اس معیار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ پرانے درہم آج کے کتنے روپے کے برابر ہوں گے۔ بدقسمتی سے اس کا تعین اس بناء پر ناممکن ہے کہ آئے دن گرانی Inflation اور Devaluation وغیرہ کی وجہ سے روپے کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اس کا جواب میں صرف یہ دے سکتا ہوں کہ اپنے مقامی علماء سے آپ یہ سوال دریافت فرماتے رہیں۔ ان شاءاللہ وہ آپ کو دھوکہ نہیں دیں گے۔ آپ کی صحیح رہنمائی کریں گے۔ بہرحال میں آپ سے اپنا خیال ظاہر کرتا ہوں کہ رقم کی کم از کم مقدار جس پر زکوٰۃ واجب ہے اس کے متعلق اولاً یہ سوچنا چاہئیے کہ عہدِ نبوی میں درہم کی قوتِ خرید کیا تھی؟ یعنی ایک درہم سے کتنا کام پورا ہو سکتا تھا اور اسی کی اساس پر ہم آج یہ دیکھیں کہ آج وہ غرض کتنے روپوں میں پوری ہوتی ہے۔ سیرت کی کتابوں میں ذکر آتا ہے کہ ۸ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے مکہ معظمہ کی فتح کے بعد وہاں حضرت عتاب بن اسید ﷺ کو گورنر مقرر فرمایا اور ان کی تیس

درہم ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔ اسی تنخواہ میں گورنر، اس کی بیوی، اس کے بچے، اس کے گھر کے ملازم اور غلام وغیرہ سب گزارہ کرتے تھے۔ میری رائے میں اس پہلو پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دو سو درہم کی جگہ آسانی کے ساتھ ایسی شرح مقرر کی جاسکے جو سامان کی گرانی کے باعث ہمیں مناسب نظر آئے۔ فرض کیجئے کہ میں ایک درہم کو ایک روپے کے برابر تصور کرلوں تو آج کل کی گرانی میں دو سو روپے اتنی حقیر رقم ہے کہ وہ ہمارے ہاں کے چپڑاسی کو بھی ماہانہ دی جائے تو وہ قبول نہیں کرتا۔

سوال ۲۱: آج کے جدید دور میں منصوبہ بندی کئی سال پہلے کرلی جاتی ہے، جب کہ اسلامی یا قمری نظام میں تاریخوں اور مہینوں کا تعین چاند کے نکلنے پر ہوتا ہے۔ اس طرح قمری نظام میں قطعیت (Exactness) پیدا نہیں ہوتی، دوسرے یہ ایک ہی دن میں، مختلف ملکوں میں، مختلف اسلامی تاریخیں پائی جاتی ہیں۔ کئی ملکوں میں مختلف دنوں میں عید منائی جاتی ہے۔ اس بحران پر کیسے قابو پایا جائے اور آیا قمری نظام میں قطعیت پیدا کی جاسکتی ہے تاکہ وہ آج کے زمانے کا ساتھ دے سکے؟

جواب: اس میں کئی سوالوں کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ الگ الگ جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر آپ منصوبہ بندی کئی سال پہلے کرتے ہیں تو قمری تقویم ہو یا شمسی کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ قمری سال کے اگر ۳۵۴ دن ہوتے ہیں؟ تو اس سال محرم کا مہینہ خواہ انتیس دن کا ہوا ہے یا تیس کا صرف ایک دن کا فرق ہوگا اور پانچ سال میں جو فرق ہوگا وہ مشکل سے ایک یا دو دن کا ہو سکتا ہے۔ اس سے ہماری منصوبہ بندی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ ہم یہی کہیں گے کہ پانچ سال کی آمدنی سے ہم پانچ سال تک آئندہ فلاں فلاں طریقے سے کام کریں گے۔ مجھے اس میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی۔ دوسرے میں یہ بھی بیان کرچکا ہوں کہ خود عہدِ نبوی کے رواج کے مطابق ہم شمسی سال کو بھی استعمال کرسکتے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بعض قبائل کو حکم دیا کہ تم سے زراعت کی زکوۃ معین مہینے میں نہیں لی جائے گی بلکہ فصل کے کٹنے پر وصول کی جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں شمسی سال پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ آپ کی بیان کردہ منصوبہ بندی کے لیے بھی اگر ہم شمسی سال پر عمل کریں مثلاً عمر خیام کے سال پر تو کوئی امر مانع نہیں، آپ کرسکتے ہیں، اسلام اس سے نہیں روکتا۔ جہاں تک عیدین کا تعلق ہے، میں اپنی حد تک اسے قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتا کہ پاکستان میں جمعرات کو عید منائی جائے اور بنگال میں جمعہ کے دن چہار شنبہ کے دن۔ کیونکہ اصل سوال یہ ہے کہ آیا میں اپنے خدا اور اپنے رسول اللہ ﷺ کے احکام کو کو پورے اخلاص، پورے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرتا ہوں کہ نہیں۔ اہمیت اس کو نہیں ہے کہ میں کس دن اس

فریضہ کو انجام دیتا ہوں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ بنگال میں اور پاکستان کے اوقات میں شاید ایک گھنٹے کا فرق ہے۔ مغرب کی نماز آپ یہاں جس وقت پڑھتے ہیں، وہاں تقریباً عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں اب بھی ہم اس شمسی یا قمری سال کے بغیر اختلاف رکھتے ہیں اور یہ مسئلہ نیا نہیں ہے۔ عہدِ صحابہؓ میں بھی یہ چیز پیش آچکی ہے کہ اسلامی مملکت کے ایک علاقے میں، چاند ایک دن دیکھا گیا اور دوسرے علاقے میں دوسرے دن۔ چنانچہ جہاں تک مجھے یاد ہے، سنن ابو داؤد میں ذکر آتا ہے کہ مدینہ منورہ سے ایک شخص امیر معاویہؓ سے ملاقات کے لیے یا کسی اور غرض سے، دمشق بھیجا گیا۔ وہ وہاں رمضان کا پورا مہینہ مقیم رہا، پھر اس نے بیان کیا کہ ہم دمشق میں ایک دن پہلے چاند دیکھ چکے ہیں اور آج انتیسویں نہیں تیسویں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے گفتگو کے دوران یہ بات کہی گئی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ہی حکم دیا ہے کہ مقامی رویت کے مطابق عمل کریں۔ چاہے دوسرے مقام کی رویت خود خلیفہ وقت کے حکم ہی سے کیوں نہ عمل میں آئی ہو۔ ان حالات میں اگر ہم آج قانونِ فطرت کے مطابق رویت ہلال دو مختلف اوقات میں کرتے ہیں، تو میرے نزدیک اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ ایک دن عید منائیں۔ لیکن عید منائیں اور نماز بھی پڑھیں۔ دوسرا شخص دوسرے دن عید منائے لیکن وہ بھی نماز کو اہمیت دے "دن" کو نہیں۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے اس لیے میرے نزدیک یکسانیت پیدا کرنے پر اصرار کرنا محض بے کار ہے۔



ڈاکٹر محمد حمید اللہ

www.facebook.com/Dr.Muhammad.Hamidullah

Visit Our website:

www.drmhamidullah.com